اک لڑکی ابابیل سی

نگہت عبداللہ

منیب احمد کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے اپنی بھاوج کو ماں کا درجہ دیا تھا۔ اور اُن کی بات پر ہمیشہ سعادت مندی سے سر جھکایا تھا۔ گو کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں بہت لائق فائق اور اچھے عہدے پر فائز تھے۔ پرسنالٹی بھی اُن کی غضب کی تھی اور یہ تو اُن کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ بڑے بھائی اور بھاوج کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور اُن کی کسی بات سے اگر اختلاف ہوتا بھی تو خاموشی اختیار کر لیتے اور ایسے باوقار شخص کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ بات بھابھی جان بھی جانتی تھیں لیکن وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھیں کہ خاندان، یا خاندان سے باہر کی کوئی لڑکی اس گھر میں آئے کیوں کہ وہ صرف اپنی بہن صوفیہ کو لانا چاہتی تھیں۔ اور جب سے گھر میں منیب احمد کی شادی کے تذکرے ہونے لگے تھے تب سے وہ صوفیہ کو کسی نہ کسی بہانے گھر بلانے لگی تھیں۔ کبھی کام کی زیادتی کا بہانہ، کبھی اپنی، یا بچوں کی بیماری پر خصوصاً منیب احمد کے سامنے اُس کی تعریف کرتیں۔ اور وہ نادان نہیں تھے سب سمجھتے تھے اور انھیں صوفیہ بُری بھی نہیں لگتی تھی۔ اچھے نین نقش کی اسمارٹ سی لڑکی تھی۔ لیکن بھابھی جان نے اُسے سامنے لانے میں دیر کر دی تھی۔ شاید اس لیے کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں جسے آنا تھا وہ صحیح وقت پر آ چکی تھی۔ اس لیے بھابھی جان کی خواہش کو سمجھنے کے باوجود وہ

انجان بنے رہے تھے۔

پھر جس روز بھابھی جان نے براہِ راست اُن سے اُن کی شادی اور پسند کی بابت پوچھی تو وہ بغیر کسی تمہید کے بولے تھے۔

''جی بھابھی جان میں خود آپ سے اس سلسلے میں بات کرنے والا تھا۔ وہ جو ''بی'' بلاک میں خواجہ صاحب ہیں اُن کی بیٹی اسماء کے لیے آپ چلی جائیں۔

اسماء......! بھابھی جان کو شدید دھچکا لگا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر پوچھ پائی تھیں۔

تم کیسے جانتے ہو اُسے......؟

بس وہ آتے جاتے خواجہ صاحب سے سلام دُعا ہو جاتی تھی۔ ایک روز وہ اپنے گھر لے گئے تو وہیں دیکھا تھا اُسے۔ انھوں نے سادگی اور صاف گوئی سے بتایا تھا۔

اور پھر بھابھی جان نے بظاہر تو کوئی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ اُن کے سامنے اُن کی پسند کو سراہا اور رشتہ لے کر بھی گئیں۔ اس کے بعد پورا ایک سال اُن کا آس و نراس میں گزرا تھا۔ انھیں بھابھی جان پر پورا بھروسا تھا اور وہ ہرگز بھی اُن کی نیت پر شبہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے جو وہ کہتیں یقین کر لیتے۔

اور وہی بات کہ اُن کا جوڑا اسماء کے ساتھ لکھا تھا جو ایک سال بعد وہ اُن کی دلہن بن کر آ گئی۔ ورنہ اس دوران بھابھی جان مسلسل بات بنانے کی بجائے بگاڑنے کی تگ و دو میں مصروف رہی تھیں۔ اس وقت بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آیا جب اوّلین شب انھوں نے چھوٹتے ہی اسماء سے کہا تھا۔

دیکھ لو میری لگن سچی تھی ورنہ تمھارے ابا نے تو کئی بار صاف جواب دے دیا تھا۔

نہیں تو...... اسماء حیران ہو کر بولی تھی۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا۔''

کون کہے گا۔ میں دیکھ نہیں رہا تھا کہ ہر چوتھے دن بھابھی جان جا کر تمھارے ابا کی خوشامد کرتی تھیں اور وہ پوری فہرست گنوا دیتے تھے تمھارے لیے آئے رشتوں کی۔ واقعی اتنے

پرپوزل تھے، یا محض رُعب ڈالتے تھے۔ منیب احمد کے ہلکے پھلکے انداز میں استہزا تھا۔

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے ابا نے کبھی بھابھی جان کے سامنے کسی اور پرپوزل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اتنی چالاک نہیں تھی جو فوراً بھابھی جان کی چالاکی سمجھ لیتی، اس لیے سادگی سے بولی تھی۔

تمھارا مطلب ہے بھابھی جان جھوٹ بولتی ہیں۔ منیب احمد کی پیشانی پر لکیریں دیکھ کر وہ سہم گئی تھی۔ تب وہ فوراً ہی نرم پڑ گئے تھے۔

خیر جانے دو، جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب تو تم میری ہو۔ میری زندگی کی ساتھی اور میں تمھیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ماں باپ کے بعد میرے لیے سب سے محترم میرے بھائی جان اور بھابھی جان ہیں۔ میں اُن کی بے حد عزت کرتا ہوں اور تم سے بھی یہی چاہوں گا۔

میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اسماء نے یقین دلایا تھا۔

اور پھر زندگی اپنی مخصوص ڈگر پر چل نکلی تھی۔ منیب احمد اپنی ازدواجی زندگی میں خوش تھے اور شاید بہت مگن بھی جبھی تو انھیں وہ جال نظر نہیں آیا تھا جو بھابھی جان بہت دھیرے دھیرے اُن کے گرد بُن رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اسماء کو بیاہ کر لے تو آئی تھیں لیکن اُس کا وجود اُن کے دل میں ایک مستقل کانٹا تھا جسے نکالنے کے بعد ہی انھیں چین آ سکتا تھا اور اس کے لیے انھوں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

ایک سال بعد جب خرم پیدا ہوا تو اس موقع پر بھابھی جان نے پھر صوفیہ کو اپنے پاس روک لیا تھا کہ اسماء کو ابھی آرام کی ضرورت ہے اور وہ اکیلی اتنا کام نہیں کر سکتیں۔ بظاہر یہ اُن کا خلوص نظر آتا تھا جس پر منیب احمد تو شک کر ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ اسماء ضرور کسی کسی وقت ٹھٹھک جاتی تھی اور اُسے بُرا بھی لگتا تھا جب صوفیہ منیب احمد کی موجودگی میں دھڑے سے اُس کے کمرے میں چلی آتی تھی۔ کوئی کام نہ ہوتے ہوئے بھی کام نکال لیتی اور خواہ مخواہ منیب احمد کے آگے پیچھے ہونے لگتی۔ ایک دو بار اسماء نے دبے لفظوں میں اُسے ٹوکا بھی لیکن وہ باز نہیں آئی تب اسماء نے منیب احمد سے کہا تھا۔

مجھے اچھا نہیں لگتا، صوفیہ بنا دستک دیئے چلی آتی ہے، حالانکہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اُسے ایٹی کیٹس آنے چاہیں۔

ارے ایک تو وہ تمھارا خیال کر رہی ہے۔ منیب احمد نے اِسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''میرا نہیں آپ کا......''

''کیا مطلب ہے تمھارا......؟''

مجھے نہیں پتا۔ بس آپ بھابھی جان سے کہہ دیں کہ وہ اپنی بہن کو اپنے پورشن تک ہی محدود رکھیں۔ میں اپنا کام خود کرلوں گی۔ اسماء نے قدرے ناراضگی سے کہا تھا۔

تمھیں ابھی آرام کی ضرورت ہے، سمجھیں۔ بھابھی جان تم سے زیادہ جانتی ہیں اور تمھیں تو اُن کا احسان مند ہونا چاہیے ساتھ میں صوفیہ کا بھی جو ہر دُکھ تکلیف میں بھاگی آتی ہے۔ کون کرتا ہے کسی کے لیے اتنا...... تمھاری بھی تو آپا ہیں، ایک دن آ گئی تھیں بیٹے کی مبارک باد دینے۔ منیب احمد نے بُرا مان کر طنز بھی کیا تھا۔

آپا اپنے گھر بار والی ہیں۔ پھر وہ یہاں نہیں رہتیں۔

یہاں ہوتیں تو کیا کرتیں۔ منیب احمد سر جھٹک کر بڑبڑائے تھے۔ اور گو کہ وہ دل پھینک قسم کے مرد نہیں تھے لیکن بہر حال مرد تھے اور انھیں ایسے وقت گھیرا گیا تھا جب فطری طور پر اُن کی بیوی کی توجہ اگر اُن سے ہٹی نہیں تھی تو بٹ ضرور گئی تھی۔ اور مرد ہمیشہ مکمل اور بھرپور توجہ چاہتا ہے جو انھیں صوفیہ کی طرف سے ملنے لگتی تھی۔ اسماء نے اس کے آنے پر اعتراض کیا تو پھر منیب احمد رات گئے تک بھابھی جان کے پورشن میں بیٹھے رہتے۔ یہاں تک کہ وہ اُن کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو جاتی تھی۔

یہ سلسلہ دنوں بلکہ مہینوں چلا۔ اسماء انھیں بچے کا احساس دلانے کی کوشش کرتی تو وہ اتنا بگڑ جاتے، جس پر اُس نے خاموشی اختیار کر لی، کیوں کہ بھابی جان کی سازش کو وہ سمجھ گئی تھی لیکن منیب احمد کو سمجھانے سے معذور تھی کیوں کہ وہ بھابھی جان کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے تھے۔ جب گھر کا محافظ خود ہی اپنے گھر کے درپے تھا تو وہ کیا کر سکتی تھی سوائے کڑھنے کے۔

اور بھابھی جان کی حکمت عملی جانے کیا تھی جو بہت دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ شاید وہ منیب احمد کو اس مقام تک لانا چاہتی تھیں جہاں انھیں صوفیہ کے سوا کچھ دکھائی دے نہ سجھائی۔ اور اس میں انھیں تین سال لگ گئے تھے۔

اُس وقت جب وہ خرم کو اسکول میں داخل کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن عمل یوں نہیں کر پا رہی تھیں کہ منیب احمد کو فرصت نہیں تھی اور وہ خود پریگننسی کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ابتدائی مہینوں میں ایک تو اُسے وومٹنگ بہت ہوتی تھی دوسرے ٹینشن بھی تھا جس نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔

اس رات بہت عاجز آ کر اُس نے منیب احمد کو احساس دلانا چاہا تو وہ بجائے اپنے رویے پر نادم ہونے کے اُلٹا اُسے الزام دیتے ہوئے کہنے لگے۔

''ہاں میں بھی تنگ آ گیا ہوں تمھاری روز روز کی بیماری سے۔ جب آتا ہوں تم منہ سر لپیٹے پڑی ہوتی ہو۔ اپنے باپ کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں تم۔''

''کیوں۔ وہاں کیوں جاؤں۔ اسماء چیخ کر بولی تھی۔''

اس لیے کہ یہاں اب صوفیہ رہے گی۔ میں شادی کر رہا ہوں اُس سے۔ منیب احمد نے ایک دم اُس کے سر پر ایٹم بم دے مارا تھا۔ کتنی دیر وہ سناٹے میں رہ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھتی رہی تھی۔ وہ اس حد تک نکل جائیں گے یہ شاید اُس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

''نہیں منیب احمد، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دوں گی۔'' وہ کہیں پاتال سے بولی تھی۔

''اجازت۔ منیب احمد استہزائیہ ہنسے تھے۔ تم سے اجازت مانگی کس نے ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ تمھیں پہلے سے خبردار کر رہا ہوں۔ اپنا بوریا بستر سمیٹو یہاں سے۔''

''نہیں۔ نہیں منیب احمد میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' وہ اُن کے اس قدر اجنبی ہونے پر ایک دم ٹوٹ گئی تھی۔ ''آپ شادی کرنا چاہتے ہیں ضرور کریں لیکن خدا کے لیے مجھے یہاں سے جانے کو نہ کہیں۔''

"جانا تو پڑے گا تمھیں کیوں کہ صوفیہ اسی شرط پر مجھ سے شادی پر راضی ہوئی ہے کہ میں تمھیں طلاق دے دوں۔ منیب احمد کی سنگ دلی انتہا کو چھوگئی تھی۔ اس کے رونے گڑگڑانے کا کچھ اثر نہیں ہوا اُن پر اور اپنا فیصلہ سنا کر آرام سے سو گئے تھے۔"

اور اُن کا آرام واطمینان بس یہیں تک تھا۔

قدرت کو اُن کی سنگ دلی نہیں بھائی تھی، یا اس معصوم پر رحم آ گیا تھا۔

اگلی صبح جب وہ سو کر اُٹھے تو اسماء کہیں نہیں تھی۔ خرم کو اُن کے پاس چھوڑ کر جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اُن کے نام بس ایک چھوٹا سا کاغذ تھا۔

"میری پیشانی پر تم نے اپنی محبت کی اَن گنت مہریں ثبت کی تھیں منیب احمد۔ اس پر اگر طلاق کا داغ لگ گیا تو میں جی نہیں سکوں گی۔ تو کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ میں اس سے پہلے ہی مر جاؤں۔ سو بار جینے مرنے سے ایک بار مرنا آسان ہے۔ تم بھی آزاد ہو جاؤ گے اور میں بھی۔"

منیب احمد نے اس وقت خط بے نیازی سے ایک طرف ڈال دیا تھا، کیوں کہ ان کے خیال میں وہ اپنے باپ کے گھر کے علاوہ اور کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اور اس وقت وہ بھابھی جان کو اُس کے جانے کی خوش خبری سنانے آئے تھے کہ صوفیہ کی آواز نے اُن کے قدم روک لیے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اگر منیب نے اسماء کو طلاق دے کر خرم کو اپنے پاس رکھ لیا تو...... میرا مطلب ہے مجھے اُن کی اولاد پالنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"اوّل تو اسماء بچے کو چھوڑے گی نہیں اور اگر چھوڑ بھی گئی تو میں رکھ لوں گی اُسے اپنے پاس۔ اور یہ میرا منیب پر ایک اور احسان ہو جائے گا۔" بھابھی جان کی آواز پر وہ مزید ٹھٹک گئے تھے۔

"ہاں۔ ساری زندگی آپ اُن پر احسان ہی تو کرتی رہی ہیں۔ صوفیہ کھلکھلا رہی تھی۔

"جب ہی تو وہ میرے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔"

"تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں اسماء کا پتا صاف کر دیا تھا۔ خواہ مخواہ شادی کرا دی اُن کی

اور اتنا عرصہ مجھے بھی انتظار کروایا۔"

"کیا بتاؤں۔ میں نے تو بہت کوشش کی تھی لیکن وہ کلو ہی قسمت میں لکھی تھی۔ اِدھر خواجہ صاحب فوراً شادی کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ میں نے ایک سال انھیں چکر دیا کہ شاید درمیان میں اُن کی بیٹی کی کہیں اور بات بن جائے، یا اِدھر منیب ہی بدظن ہو جائے لیکن...... بھابھی جان اپنا کارنامہ بیان کر رہی تھیں۔

اور اِدھر منیب احمد کی آنکھوں سے پردے ہٹتے جا رہے تھے۔ وہ عورت جسے انھوں نے ماں کا درجہ دیا تھا وہ کس طرح اُن کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔ گویا اُن کی حیثیت کٹھ پتلی کی سی تھی۔ اس وقت منیب احمد کا دل چاہا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو جائیں اور انھوں نے ہینڈل گھمایا بھی تھا لیکن اُدھر خرم کے رونے کی آواز نے انھیں وہیں سے واپس پلٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر خرم کو لے کر خواجہ صاحب کی طرف دوڑے تھے۔ انھیں یقین تھا اسماء وہیں ہوگی، لیکن وہ وہاں تو کیا سارے شہر میں کہیں نہیں تھی۔ کتنے دن انھوں نے اُس کی تلاش میں شہر بھر کی خاک چھانی تھی اور پھر وہ خواجہ صاحب سے خائف تھے کہ اگر انھوں نے اپنی بیٹی کی گمشدگی کا دعویٰ کر دیا تو وہ کیا کریں گے۔ انھیں اسماء کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جب خرم کو لے کر گئے تھے تو خواجہ صاحب نے چھوٹتے ہی اسماء کا پوچھا تھا کہ اُسے ساتھ نہیں لائے اور وہ بات بنا کر چلے آئے تھے۔ اس کے بعد اُن کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کسی وقت جا کر انھیں تمام حالات بتائے۔ اپنے طور پر اُسے تلاش کرتے رہے اور جب مایوس ہو گئے تو اپنا بوریا بستر باندھ لیا تھا۔

بھابھی جان اور صوفیہ بھی پوچھ پوچھ کر تھک گئی کہ انھیں کیا ہوا ہے۔ لیکن وہ کچھ نہیں بولے اور اِسی خاموشی سے ایک روز خرم کو لے کر یہ ملک ہی چھوڑ گئے تھے۔

جیسے جیسے رات بیت رہی تھی، خنکی بڑھ رہی تھی۔ گو کہ کھڑکی اور دروازہ بھی اُس نے خود اچھی طرح بند کیا تھا پھر جانے کن درزوں سے ہوا کمرے میں داخل ہو کر براہِ راست اُس کے چہرے کو چھو رہی تھی اور کوئی وقت ہوتا تو وہ لحاف کے اندر منہ چھپا کر سو جاتی لیکن اب امی کا خیال تھا، جنھیں کچھ دیر پہلے اُس نے دوا دے کر سلایا تھا اور خود اس خیال سے جاگ رہی تھی کہ

کہیں امی کسی ضرورت کے تحت اُسے پکار نہ لیں۔ حالانکہ اس کا امکان کم تھا۔ کیوں کہ دوا میں نیند کی ٹیبلٹ بھی شامل تھی۔ اس نے فوری اثر دکھایا تھا۔ امی گہری نیند سو رہی تھیں۔ پھر بھی وہ وقفے وقفے سے چونک کر انھیں یوں دیکھتی جیسے انھوں نے اُسے پکارا ہو۔ جانے کیوں وہ اتنی وہمی ہو رہی تھی۔

امی کروٹ بدلتے ہوئے کچھ بڑبڑائی تھیں اور وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''جی امی۔'' دوسرے پل وہ اپنے بیڈ سے اُتر کر اُن کے قریب آگئی اور آہستہ سے اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو شام کی نسبت بخار نہ ہونے کے برابر تھا۔

اللہ تیرا شکر ہے۔ اُس نے گہری سانس کے ساتھ دل ہی دل میں شکر کیا۔ ماں کی محبت کے احساس سے اُس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ دِل چاہا اُن کی آغوش میں چھپ کر سو جائے۔ اگر اُن کی طبیعت خراب نہ ہوتی تو وہ ایسا ہی کرتی لیکن اب اُن کے آرام کا خیال تھا۔ وہ جس آہستگی سے آئی تھی اسی طرح واپس اپنے بیڈ پر آگئی اور لحاف میں منہ چھپایا تو کچھ دیر بعد سو بھی گئی تھی۔

صبح قدرے تاخیر سے اُس کی آنکھ کھلی تو کچن سے برتنوں کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے فوراً امی کا بیڈ دیکھا پھر لحاف پھینک کر بھاگتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

''امی یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔'' وہ کچن کے دروازے ہی سے چیخی تھی۔ ''کل اتنا تیز بخار تھا آپ کو اور اب ٹھنڈے پانی میں ہاتھ ڈالے کھڑی ہیں۔ خدا کے لیے اپنے آپ پر نہیں تو مجھ پر رحم کریں۔''

''میری جان، میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ جاؤ تم منہ ہاتھ دھو لو ناشتا تیار ہے۔''
اسماء نے دھیرے سے کہا۔

''آپ نے ناشتا بھی بنا لیا۔ کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ ایک دو دن آرام نہیں کر سکتی تھیں۔''

''بالکل نہیں۔'' اسماء مسکرا کر گویا ہوئی۔ ''چلو جلدی کرو میں چائے کا پانی رکھ رہی ہوں۔

اتنے میں تم منہ دھو کر آ جاؤ ورنہ ٹھنڈی چائے ملے گی۔''

''ابا آجائیں پھر دیکھئے گا میں کتنی شکایتیں کروں گی آپ کی۔'' وہ کہتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔

''روبا، روبا۔'' پنجرے میں قید طوطا اُسے دیکھتے ہی چلانے لگا تو وہ مصنوعی خفگی سے اُسے گھور کر بولی۔

''جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتی۔''

''روبا۔ روبا......''

''شٹ اپ۔ اُس نے آنگن میں لگے واش بیسن کا نل کھول کر ہاتھ میں تھوڑا سا پانی لے کر طوطے پر اُچھال دیا۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر اندر آئی تو اسماء تخت پوش پر ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھی۔

''نانا ابا کب آنے کا کہہ گئے تھے؟'' اُس نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''جمعہ تک آنے کا کہہ گئے تھے۔ اب دیکھو کب آتے ہیں۔'' اسماء جواب دے کر جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

وہ تولیہ پھینک کر تخت پر آبیٹھی اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگی۔ گاہے گاہے اسماء پر نظر ڈال لیتی جس کے چہرے پر سوچوں کی لکیریں واضح ہونے لگی تھیں۔ اُس نے بہت چاہا کہ ٹوکنے سے گریز کرے لیکن رہ نہیں سکی۔ اور قدرے جھنجلا کر بولی۔

''کیا سوچتی رہتی ہیں ہر وقت؟''

اسماء نے اپنی سوچوں سے نکل کر اُسے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

''کوئی پریشانی کی بات ہے تو مجھے بتائیں۔ میں اب بچی نہیں ہوں۔ شیئر کر سکتی ہوں آپ کے ساتھ......''

''مجھے پتا ہے، بہت بڑی ہوگئی ہو تم۔'' اسماء نے اُس کی بات کو ہلکے پھلکے انداز میں

اُڑا لیا۔

''پھر آپ مجھ پر اعتماد کیوں نہیں کرتیں۔'' اس کا لہجہ روٹھا ہوا تھا۔

''میری جان سب سے زیادہ میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔'' اسماء اُس کا گال تھپک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو جا کہاں رہی ہیں۔''

''سبزی والے کی آواز آرہی ہے۔ یہیں سے لے لوں ورنہ پھر آگے جانا پڑے گا۔'' اسماء کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تو اُس نے بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں ختم کی۔ پھر برتن کچن میں رکھ کر واپس کمرے میں آئی اور الماری کھول کر رات جو کپڑے پریس کیے تھے نکال لیے۔

کچھ دیر بعد اسماء کمرے میں آئی اور اُسے تیار ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''کہاں جارہی ہو......؟'' پھر فوراً خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔ بیٹا جب بغیر سفارش کے نوکری نہیں ملتی تو تم کیوں دھکے کھاتی ہو۔

''جب تک قسمت میں دھکے لکھے ہیں کھانے پڑیں گے۔ بس آپ مجھے نہیں روکیں بلکہ دعا کریں اور ہاں دوپہر میں کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا مجھے دو تین جگہ جانا ہے۔'' اُس نے جلدی جلدی بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا۔

''تمھارے نانا ابا تو کہتے ہیں اب مجھے تمھاری شادی کر دینی چاہیے۔'' اسماء نے کہا تو ایک لمحہ کو اُس کے بالوں میں حرکت کرتے ہاتھ رُک گئے۔ پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی لکیر بھی ایک لمحہ کو اُبھری تھی پھر فوراً ہی وہ اُسی طرح متحرک ہوگئی۔ برش پھینک کر بالوں کو ربر بینڈ میں قید کیا پھر پیروں میں شوز پہن کر جانے کو تیار ہوگئی تھی۔

گیارہ بج رہے تھے۔ دینو بابا کوئی چوتھی بار اُن سے ناشتے کا پوچھنے آئے تو انھوں نے ایک بار پھر انھیں صرف چائے لانے کا کہہ دیا۔ جس پر دینو بابا سرزش کیے بغیر رہ نہیں سکے۔

''خالی پیٹ اتنی چائے اچھی نہیں ہوتی میاں۔ تین کپ پی چکے آپ۔ اب جب تک

کچھ کھائیں گے نہیں، ہم چائے نہیں دیں گے۔''

''ارے تو ناراض کیوں ہوتے ہیں دینو بابا۔ یہ بات اگر آپ پہلے کپ کے بعد ہی کہہ دیتے تو میں اُسی وقت خود کو ناشتا کرنے کے لیے تیار کر لیتا۔'' وہ گھٹنوں پر پھیلی اخبار سمیٹتے ہوئے بولے۔

''بس تو اب تیار ہو جائیے، ہم ناشتا بنائے دیتے ہیں۔'' دینو بابا کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ انھوں نے ریسٹ واچ اُٹھا کر ٹائم دیکھا پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تقریباً بیس منٹ انھیں شاور لینے اور ڈریسنگ میں لگے۔ اس کے بعد نیچے آئے تو انھیں ایک دم سے روبی کی کمی محسوس ہونے لگی، جیسے دو روز پہلے رُخصت کر کے وہ اپنے اس آخری فرض سے سبک دوش ہوگئے تھے۔ اس وقت جہاں وہ بہنوں کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھا دینے پر خوش تھے وہاں انھیں اپنے ماں باپ شدت سے یاد آرہے تھے۔ جن کی پانچ سال پہلے حادثاتی موت نے انھیں ایک دم سے بہت بڑا اور سنجیدہ بنا دیا تھا۔ یوں بھی وہ گھر میں سب سے بڑے تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ جوان ہوتی بہنوں کے باپ بن جائیں۔

اُس وقت وہ ایم بی اے کر رہے تھے اور امریکا میں تھے۔ وہیں انھیں ممی ڈیڈی کی، روڈ ایکسڈینٹ میں موت کی خبر ملی تو وہ اپنا آخری سمسٹر چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ کیوں کہ اُن سے چھوٹی تین بہنیں تھیں۔ اور عزیز رشتہ دار تھے تو لیکن اوّل تو کوئی زیادہ عرصہ اپنا گھر بار چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ دوسرے انھیں کسی پر بھروسا بھی نہیں تھا۔ اس لیے وہ ممی ڈیڈی کے انتقال پر آئے تو واپس جانے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ اور اُسی وقت سے ڈیڈی کا بزنس سنبھال لیا تھا۔ اور بہنوں کو بھی ماں باپ کے بعد بڑے بھائی کا بڑا سہارا تھا۔ اُس وقت اُن کے بعد نتاشہ تھی جو بی اے کے آخری سال میں تھی۔ انھوں نے اپنے کاندھوں پر آجانے والی اچانک ذمہ داریوں کو پوری سنجیدگی سے محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے وہ ایک دم سے بہت بڑے ہوگئے تھے۔ اپنی عمر سے کئی گنا زیادہ۔ پھر بھی انسان تن تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہر عمر میں اُسے کسی ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے اور اُن کا کڑے وقتوں میں اگر صحیح معنوں میں کسی نے پورے خلوص اور ایمان داری سے ساتھ دیا تھا تو وہ اُن کے دوست اذعان اور اُس کی والدہ تھیں۔ خود اذعان اُن کے ساتھ امریکا

میں تھا۔ دونوں یہاں سے ساتھ ہی گئے تھے اور ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ واپس بھی دونوں کو ساتھ ہی آنا تھا لیکن تقدیر کی ستم ظریفی انھیں پہلے لے آئی تھی۔ بہر حال وہ وقت گزر گیا تھا جس نے انھیں اپنے پرائے کی پہچان کرانے کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

نتاشہ کی انھوں نے بی اے کے فوراً بعد شادی کر دی تھی۔ اور اس طرح دو سال بعد تانیہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی۔ اس کے بعد روبی تھی۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث بہت لاڈلی بھی تھی اور کیوں کہ اس کے ساتھ اُن کا زیادہ وقت گزرا تھا اس لیے اب اُس کی شادی کر کے وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ نتاشہ اور تانیہ نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ پہلے اپنا گھر بسائیں اس کے بعد روبی کو رُخصت کریں، لیکن انھوں نے جو اوّل روز سے سوچ لیا تھا کہ ان تینوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد ہی وہ اپنے بارے میں سوچیں گے تو اس پر قائم رہ کر انھوں نے اپنی ذات سے نظریں چرالی تھیں۔ اور اس کا انھیں کوئی ملال تھا نہ پچھتاوا۔ اس کے برعکس روزِ محشر اپنے والدین کے سامنے سرخروئی کے احساس نے ان کے اندر اطمینان بھر دیا تھا۔ اور پھر انھیں کوئی کمی نہیں تھی۔ گو کہ بہت لڑکیاں ان کے انتظار میں اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں پھر بھی ابھی بہت گھرانے ایسے بھی تھے جو اُن سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ روبی کی شادی میں تو کچھ نے اشارتاً کہا بھی تھا اور وہ خوب صورتی سے ٹال گئے تھے۔ کیوں کہ حقیقتاً انھوں نے ابھی تک اپنے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اور اب جب کہ روبی کی شادی سے بھی فارغ ہو گئے تھے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ فوراً اپنے بارے میں سوچنے بیٹھ جاتے۔ جو شخص مسلسل اپنی نفی کر رہا ہو اُسے پھر اچانک ہی کبھی اپنا خیال آتا ہے۔ احساس دلانے سے کچھ نہیں ہوتا۔

فی الحال تو وہ آرام کے موڈ میں تھے۔ کل بھی آفس نہیں گئے تھے اور آج بھی ابھی تک تو موڈ نہیں بنا تھا۔ بارہ بجے ناشتے سے فارغ ہوئے تو لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد دینو بابا اُدھر سے گزرے تو انھیں دیکھ کر رُک گئے اور قدرے تشویش سے پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے میاں، آپ آفس نہیں جا رہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

"ہوں۔" انھوں نے پہلے گہری سانس کھینچی تھی۔ "سب ٹھیک ہے بابا۔ بس وہ اپنی روبی

چلی گئی تو عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"اللہ خوش رکھے۔ سکھی رکھے اپنی بیٹیا کو۔ اُن کے جانے سے اِدھر تو سچ مچ بہت سونا ہو گیا ہے۔" دینو بابا بھی اداس ہو گئے۔

"پتا نہیں فوراً ہنی مون پر جانے کی کیا تک تھی۔ کچھ دن بعد چلے جاتے۔" وہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب میاں آپ دلہن لے آئیں تو گھر میں رونق ہوگی۔" دینو بابا نے کہا تو وہ اَن سنی کرتے ہوئے بولے۔

میرا خیال ہے میں آفس کا چکر لگا ہی آؤں۔ فاروقی صاحب کے دو فون آ چکے ہیں۔

اور اذعان میاں کا بھی آیا تھا جب آپ نہا رہے تھے۔ دینو بابا کو اچانک یاد آیا۔

"اچھا۔ کیا کہہ رہا تھا......؟" انھوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتا نہیں میاں۔ اُن کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ خود بات کر لیجیے گا۔"

"اچھی بات ہے پھر میں چلتا ہوں۔ وہ ٹائم دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ڈرائیور نے انھیں دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھول دیا جسے بند کر کے وہ اُس سے چابی لے کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے۔ ایک تو یہیں بج گیا تھا۔

سردیوں کے چھوٹے دنوں میں تو بس یونہی صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ درمیان کا وقت تو پتا ہی نہیں چلتا۔ انھیں اب اپنا گیارہ بجے تک کمبل میں بیٹھے رہنا کھلنے لگا۔

اگر صبح ہی آفس چلے جاتے تو کتنے کام ہو سکتے تھے۔ اب تو بس جائیں گے اور آئیں گے۔ اس خیال سے انھیں کوفت سی ہونے لگی، یا شاید کوفت کا سبب وہ بائیک تھی جو تیز آواز کے ساتھ کبھی اُن کے دائیں جانب آ جاتی کبھی بائیں جانب، اور کبھی بالکل سامنے لہرانے لگتی۔ پتا نہیں اس نوجوان کا منشا کیا تھا جو اُن کی اسپیڈ کے ساتھ بائیک دوڑا رہا تھا۔ نہ آگے نکلنے دیتا نہ پیچھے چھوڑنے پر آمادہ۔

"نان سنس۔ انھوں نے بے حد جھنجلا کر اپنی گاڑی کی اسپیڈ نہ ہونے کے برابر کر دی

جس پر اُس نوجوان نے پلٹ کر انھیں ہاتھ ہلایا پھر فل اسپیڈ سے اپنی بائیک بھگا دی اور اسی رفتار سے فٹ پاتھ پر کھڑی لڑکی کا بیگ بھی لیتا گیا تھا۔

''مائی گاڈ۔'' انھیں اُس کی اس حرکت سے شدید دھچکا لگا تھا، اور اس کے پیچھے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ البتہ اُس لڑکی کے قریب گاڑی روکنے سے وہ باز نہیں رہ سکے۔ اور اخلاق، ہمدردی، انسانیت کتنے ناتے لیے وہ گاڑی سے اُتر کر اُس کے پاس چلے گئے۔

وہ بہت سراساں سی اُسی طرف دیکھ رہی تھی جس طرف بائیک گئی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ ہونٹوں پر جما ہوا تھا۔ غالباً اپنی چیخ دبائی تھی اور نہ بھی دباتی تو کون سننے والا تھا۔ وہ بھی دیکھ کر ہی رُکے تھے۔

''ایکسکیوزمی۔'' انھوں نے اُسے متوجہ کیا تو وہ اُچھل کر دو قدم پیچھے ہٹی اور سہمی ہوئی نظروں سے انھیں دیکھنے لگی۔

''وہ آپ کا بیگ لے گیا۔ انھوں نے مدد کی آفر کرنے سے پہلے اپنے طور پر یہ جتانا چاہا کہ اُسے مدد کی ضرورت ہے اور وہ اس پر ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''اب آپ کیا لینا چاہتے ہیں۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ یہ دیکھیں میرے ہاتھ، گھڑی ہے نہ کوئی انگوٹھی اور اس بیگ میں بھی کوئی خزانہ نہیں تھا بڑی مایوسی ہوگی اُسے اور آپ کو بھی۔''

''مجھے......'' نہ سمجھنے والے انداز میں اُن کی پیشانی پر ہلکی سی لکیر اُبھری تھی۔

''زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دیکھ رہی تھی وہ آپ کے ساتھ تھا اور آپ کے اشارے پر ہی اُس نے یہ واردات کی ہے۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے شریف آدمی لگ رہے ہیں۔'' وہ جو منہ میں آیا کہے جا رہی تھی اور وہ ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑے۔

''شٹ اپ۔ یونو......''

وہ ایک دم خاموش ہوگئی تو وہ قدرے رُک کر خود پر قابو پا کر بولے۔

''چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''

''جی نہیں۔'' وہ پھر اُچھل پڑی۔ اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں میں جو آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں گی۔ بڑے آئے کہیں سے ہیرو بن کر، پہلے خود ولن بھیجا۔

''لاحول ولا قوۃ۔ آج دن کا آغاز ہی اچھا نہیں ہوا۔'' انھوں نے اُس کی بات پر سلگ کر سوچا پھر اُسے دیکھ کر قدرے بے نیازی سے کندھے اُچکا کر بولے۔

''آپ کی مرضی۔ میں نے تو اس خیال سے ڈراپ کرنے کی آفر کی کہ پتا نہیں آپ کے پاس......''

''ہاں نہیں ہے کرایہ۔ پیدل چلی جاؤں گی۔ سمجھے آپ۔'' وہ فوراً اُن کی بات کاٹ کر دھاڑی تو اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ دِل چاہا ایک زوردار طمانچے سے اُس کا دماغ ٹھکانے لگا دیں۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر گاڑی میں آ بیٹھے اور فوراً اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اُن کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔ اور عجیب بات تھی کہ اس لڑکی سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ انھیں کیا ضرورت تھیں رُکنے کی۔

امی......امی...... اُس نے دروازے سے داخل ہوتے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔ جلدی سے پچاس روپے نکالیں، رکشہ والے کو دینے ہیں۔

''پچاس روپے۔ رکشہ......'' امی نے سرتاپا اُسے جن نظروں سے دیکھا اُس سے وہ اُلجھ کر بولی۔

''مجبوری میں آئی ہوں۔ آپ پہلے پیسے تو دیں پھر بتاتی ہوں۔''

اسماء نے ناچار پچاس روپے نکال کر دیئے تو وہ بھاگ کر رکشہ فارغ کر آئی۔ پھر اسماء کے پوچھنے سے پہلے ہی بتانے لگی۔

''ایک اسکوٹر والا میرا بیگ چھین کر لے گیا۔ وہاں سے میں پیدل تو آ نہیں سکتی تھی اس لیے رکشہ میں بیٹھ گئی اور اس کا خیال بھی مجھے فوراً نہیں آیا تھا کتنی دیر تو پریشان ہوتی رہی کہ گھر

کیسے جاؤں گی جبھی تو اتنی دیر ہوگئی ورنہ دو بجے ہی آ جاتی۔

اسماء اُس کے پہلے جملے پر ہی گم صم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد تو شاید وہ سن بھی نہیں رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''آپ۔ آپ ناراض تو نہیں ہیں؟'' اُس نے اسماء کو خاموش دیکھ کر پوچھا تو اُس نے ایک دم اُسے بازوؤں میں لے لیا۔

''بیٹا، اب تم کہیں نہیں جانا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے نوکری وکری کرنے کی۔ سارا وقت میری جان اٹکی رہے گی۔ پتا نہیں باہر دنیا کیسی ہے۔ اس نے تمھیں تو کچھ نہیں کہا نا؟

''کس نے......؟'' وہ سمجھی نہیں۔

''اُس اسکوٹر والے نے......''

''ارے امی، وہ اگر ذرا دیر بھی رُکتا نا تو میں اُس کا وہ حشر کرتی کہ ساری زندگی یاد کرتا۔ وہ تو اتنی اسپیڈ سے گیا کہ میں بس دیکھتی رہ گئی۔'' وہ یک دم پرجوش ہو کر بولنے لگی تھی۔

''بس بیٹا، اب تم باہر نہیں جانا......'' اسماء حد درجہ خائف تھی۔

''ایسے ہی نہیں جانا۔ اب تو روز جانا ہوگا۔ کیوں کہ مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔'' اُس نے خوش ہو کر اسماء کے گلے میں بازو ڈال دیے اور انھیں دائیں بائیں جھلاتی ہوئی کہنے لگی۔ ''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ہر روز ایسے واقعے تھوڑی ہوتے ہیں۔ پھر اب تو میں بہت ہوشیار رہوں گی۔''

''لیکن بیٹا......؟''

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ مجھے جاب کرنی ہے اور یہ ہماری ضرورت ہے امی۔ نانا ابا بے چارے بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اب ہمیں انھیں آرام دینا چاہیے۔ کم از کم میں تو اُن کی ذمہ داری نہیں تھی پھر بھی انھوں نے مجھے کوئی ی نہیں ہونے دی۔ اب کیا یہ میرا فرض نہیں ہے کہ میں انھیں آرام پہنچاؤں۔''

اُس کی بات ٹھیک تھی اس لیے اسماء خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔

''کب سے جانا ہے تمھیں......؟''

''کل سے۔ کل ہی جوائن کروں گی۔ میرا اپائنٹمنٹ......'' وہ جوش سے بولتے ہوئے ایک دم خاموش ہوگئی پھر سر پکڑ کر بولی۔ ''اپائنٹمنٹ لیٹر تو بیگ میں تھا۔ اور اس مونچھوں والے نے کہا تھا کل ایم ڈی کو دکھا کر اس پر سائن کروالوں تو میری جاب پکی ہو جائے گی۔ اب کیسے پکی ہوگی، میں کیا لے کر جاؤں گی ایم ڈی کے پاس، اللہ سمجھے اس سے۔ اُس کا اسکوٹر کسی......''

''نہ بیٹی، ایسے نہیں کہتے۔'' اسماء نے فوراً ٹوک دیا۔

''پھر کیا کہوں۔ اتنی مشکل سے جاب ملی تھی۔'' وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

''مل جائے گی اور مل جائے گی۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ چلو اُٹھو منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمھارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔'' اسماء اُسے تسلی دیتے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی کہ اُس نے روک دیا۔

''میں خود گرم کرلوں گی۔ آپ نے کھایا یا نہیں۔''

''ہاں کھا لیا تھا۔ البتہ کھانے کے بعد چائے بناؤ تو آدھا کپ دے دینا مجھے۔'' اسماء نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔

برآمدے میں اُس کا مٹھو خلافِ توقع اُسے دیکھ کر چلایا نہیں تو وہ کچن میں جاتے جاتے پلٹ کر اُس کے پنجرے کے پاس آ گئی اور سلاخوں سے اندر انگلی ڈال کر اُس کی چونچ ہلاتے ہوئے بولی۔

''تمھیں کیا ہوا ہے کھانا نہیں ملا، یا ناراض ہو مجھ سے۔ لیکن کس بات پر۔ بولو نا۔''

''ٹیں ٹیں۔'' طوطے نے اپنی مخصوص آواز نکالی۔

''ایسے نہیں۔ میرا نام لو۔ نہیں۔ تمھاری مرضی۔'' وہ پنجرہ چھوڑ کر کچن میں آ گئی اور کھانا گرم کر کے وہیں پٹری پر بیٹھ کر کھاتے ہوئے وہ کل کے بارے میں سوچنے لگی کہ اُسے دوبارہ اُس فرم میں جانا چاہیے یا نہیں۔

چلی جاؤں گی اور بتا دوں گی کہ میرے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا۔ وہ مونچھوں والا اچھا آدمی

لگ رہا تھا۔ دوبارہ لیٹر ٹائپ کر دے گا۔ وہ آخر ایک نتیجے پر پہنچ کر خود کو تسلی بھی دیتی رہی تھی اور اگلی صبح اسماء کو کافی اطمینان دلا کر گھر سے نکلی تھی۔

شاید قسمت اُس کا ساتھ دے رہی تھی جو اُسے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور اُس کی بات سنتے ہی دوسرا لیٹر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا جس پر وہ بے ساختہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو۔ تھینک یو سر۔ میرا تو خیال تھا آپ میرا یقین نہیں کریں گے اور مجھے لاپرواہ سمجھتے ہوئے فوراً نکال باہر کریں گے۔''

''ایسا ہو سکتا تھا اگر ہم شہر کے حالات سے واقف نہ ہوتے۔ یہ آج کل کے نوجوانوں کا مشغلہ ہے۔ اسٹاپ پر کھڑی لڑکیوں کے پرس چھین کر لے جانا۔ بہر حال اب آپ احتیاط کیجیے گا اور ہاں میں سر نہیں اشفاق ہوں۔ سر تقریباً دس بجے آئیں گے۔'' انھوں نے نرمی سے کہتے ہوئے اپنے تعارف کے ساتھ بتایا تو وہ جانے کس خیال سے کچھ مایوس سی ہو کر پوچھنے لگی۔

''میرا اسلیکشن تو ہو چکا ہے نا؟''

''جی ہاں۔ اطمینان رکھیں۔ سر دوبارہ انٹرویو نہیں لیں گے آپ کا۔''

''میں انٹرویو سے نہیں گھبراتی۔ شفارشیوں سے گھبراتی ہوں۔ اس دوران اگر سر کے پاس کوئی سفارشی آ گیا ہوگا تو میری تو چھٹی ہوگئی۔'' اس کی اتنی صاف گوئی پر اشفاق صاحب بے ساختہ مسکرائے تھے۔

''نہیں بی بی ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا، خیر فی الحال آپ یہیں تشریف رکھیں۔ لیٹر سائن ہونے کے بعد آپ کو آپ کی جگہ دکھا دی جائے گی۔''

''تھینک یو۔'' وہ دیوار کے ساتھ رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور خاموشی سے اشفاق صاحب کو کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''آپ کے فادر کیا کرتے ہیں۔'' اشفاق صاحب نے اپنی فائل میں مصروف رہ کر غالباً بات کرنے کی غرض سے پوچھ لیا تو وہ جواب دینے کی بجائے اپنا پرس کھول کر اس میں ادھر

اُدھر ہاتھ مارنے لگی جیسے اُن کی بات سنی ہی نہیں۔ پھر بیگ بند کر کے خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''دس تو بج رہے ہیں۔''

''ہوں۔'' اشفاق صاحب نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا پھر سمجھ کر بولے۔ ''سر آنے والے ہوں گے۔ وہ کبھی لیٹ نہیں ہوتے۔ بس ادھر کچھ......'' میرا خیال ہے آگئے۔ آپ یہیں رکیں میں ابھی آتا ہوں۔ وہ انھیں عجلت میں جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر اپنا نیا اپائنٹمنٹ لیٹر نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اُن کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔

اُسے ہمیشہ سے اپنی صلاحیتوں پر بھروسا رہا تھا، اور خاصی پُر اعتماد بھی تھی۔ لیکن جاب کے لیے کیوں کہ پہلی بار گھر سے نکلی تھی اس لیے کچھ نروس ہو رہی تھی، کہ جانے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے۔ اشفاق صاحب جنھیں وہ مونچھوں والا کہہ رہی تھی وہ تو اچھے مشفق انسان تھے اب آگے جانے باس کیسے ہوں۔ اُن کا سامنا کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگی تھی کہ اشفاق صاحب آگئے۔

جائیں بی بی آپ کو سر بلا رہے ہیں۔

''کہاں؟'' وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔

''یہاں سے رائٹ ہینڈ پر سیدھا اُن کا کمرہ ہے۔ چلی جائیں گی یا......''

''چلی جاؤں گی۔ تھینک یو۔'' وہ فوراً کہہ کر اُن کے کمرے سے نکل آئی۔ سیدھے ہاتھ پر تقریباً دس قدم کی راہ داری تھی جس کے اختتام پر گلاس ڈور کے قریب رُک کر اُس نے پہلے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا پھر اُنگلی سے ہلکی سی دستک کے بعد ذرا سا دروازہ دھکیل کر بولی۔

''مے آئی کم اِن سر۔''

''یس۔'' اجازت ملتے ہی اُس نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو بُری طرح چکرا گئی۔ جب کہ اُدھر بس ایک لحظہ کو آنکھیں ذرا سا سمٹی تھیں اس کے بعد بڑا نارمل انداز تھا۔ اپنے سامنے چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''پلیز''۔

''میرے خدا۔'' وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی چیئر تک آئی اور لیٹر اُن کی طرف بڑھا دیا جسے لے کر انھوں نے فوراً اس پر سائن کر دیئے پھر اُسے دیکھ کر مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''آئی ہوپ کہ آپ یہاں جلدی ایڈجسٹ کر لیں گی۔''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں پوری کوشش کروں گی لیکن آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

''آپ کی یہ فریش جاب ہے۔ اس لیے کوئی بھی پرابلم ہو تو بلا جھجک کہہ دیجیے گا۔ مجھ سے، یا اگر میں نہ ہوں تو اشفاق صاحب سے۔ اوکے۔'' آخر میں انھوں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بول سکی تو وہ انٹر کام پر اشفاق صاحب سے بات کرنے لگے۔ اس کے بعد پھر اُس سے مخاطب ہوئے۔

''وہ آپ کا روم ہے۔ آپ وہاں چلی جائیں۔ کچھ دیر میں اشفاق صاحب آپ کو کام سمجھا دیں گے۔''

اُس نے کسی معمول کی طرح اُن کے ہاتھ کے اشارے کی سمت دیکھا جیسے وہ اُس کا روم کہہ رہے تھے وہ اُن کے روم سے ملحقہ چھوٹا سا کیبن لگ رہا تھا۔ اور اُسے وہاں بیٹھ کر کام کرنا تھا۔ ضرورت کے تحت آئی تھی جگہ کے انتخاب کا اُس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا، چاہے ایک کونے میں اسٹول پر بٹھا دی جاتی تب بھی اعتراض نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے، بہت خاموشی سے اُٹھ کر جانے لگی کہ انھوں نے پکار لیا۔

''مس عروبہ منیب۔''

''یا اللہ۔'' اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا کہ اب ضرور اُس کے کل کے رویے پر ملامت ہوگی لیکن اس کے برعکس انھوں نے بڑی خوب صورتی سے اُس کی خاموشی کو جتایا تھا۔

''جب اشفاق صاحب آپ کو کام سمجھا دیں تو انھیں تھینک یو ضرور کہیے گا۔''

''تھینک یو سر۔'' اس نے فوراً سمجھ کر اُن کا شکریہ ادا کیا تو اُن کے آبروؤں میں ہلکی سی

جنبش ہوئی تھی جیسے اُس کے فوراً سمجھنے پر حیران ہوئے ہوں۔

''میں جاؤں سر۔'' وہ یک لخت پراعتماد ہوگئی تھی۔

انھوں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ ایک بار پھر تھینک یو کہہ کر اپنے روم میں آئی تو اُسے خوش گوار سا جھٹکا لگا تھا کہ اس کیبن نما کمرے میں ہر شے قرینے سے اور بے حد چمکتی ہوئی تھی۔ اتنے خوب صورت ماحول کا اس نے حقیقتاً تصور بھی نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے وہ جتنی جگہوں پر انٹرویو کے لیے گئی تھی وہاں باس کا آفس بھی ایسا نہیں تھا۔ اُسے ایک دم اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں خود کو ریوالونگ چیئر پر گرایا تو درمیان میں گلاس وال دیکھ کر اُس کی ساری خوشی ہوا ہوگئی اور فوراً سنبھل کر سیدھی ہو بیٹھی کیوں کہ اُدھر باس گو کہ اپنے کام میں مصروف تھے لیکن کسی وقت بھی دیکھ سکتے تھے۔

منیب احمد لائٹ آف کرنے کے ارادے سے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھے تھے کہ ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانک کر خرم نے انھیں پکار کر پوچھا۔

''پاپا آپ سو تو نہیں رہے۔''

''نہیں آؤ۔'' منیب احمد واپس پلٹ کر مسہری پر آ بیٹھے۔ تمھیں نیند نہیں آ رہی۔

''بس وہ دوپہر میں بہت دیر تک سو گیا تھا۔ اگر آپ کو نیند آ رہی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' خرم اندر آ کر واپس پلٹنے لگا تھا کہ انھوں نے روک دیا۔

''بیٹھو بیٹا۔ جب مجھے نیند آئے گی تب میں خود تمھیں گڈ نائٹ کہہ دوں گا۔''

''اوکے۔ اور اگر کافی پینا چاہیں
تو بتا دیں۔ صفدر ابھی جاگ رہا ہے۔'' خرم نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا۔ ابھی میں نے دودھ میں اوولٹین لیا ہے۔'' منیب احمد نے سہولت سے منع کرتے ہوئے سگار اُٹھا لیا اور اُسے سلگانے کے بعد پوچھنے لگے۔

''دن میں کہاں چلے گئے تھے تم؟''

''بڑے ابا کی طرف گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی کھانے پر روک لیا۔ پھر وہاں سے واپس آیا تو سو گیا۔ آپ اُس وقت گھر پر نہیں تھے۔''

''ہاں ایک پرانے دوست کا پتا مل گیا تھا میں اُس کے پاس چلا گیا تھا۔'' منیب احمد نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں بتایا۔

''پھر۔ میرا مطلب ہے کچھ پتا چلا اُن سے۔'' خرم نے بڑی بے قراری سے پوچھا۔ منیب احمد چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

''کس بات کا؟''

''ممی کا۔'' آپ نے اُن سے ممی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ خرم پورے دھیان سے انھیں دیکھ رہا تھا۔

''اُسے نہیں معلوم۔'' منیب احمد نے نظریں چرا کر مختصر جواب دیا تو خرم جیسے عاجز آ کر کہنے لگا۔

''پھر کس سے معلوم ہوگا پاپا۔ ایک سال ہو گیا ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے، اور ابھی تک......''

''دھیرج بیٹا دھیرج۔ مجھے لگتا ہے وہ اس شہر میں نہیں ہیں۔''

''کہیں بھی ہوں۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں۔ ہمیں اُن تک پہنچنا ہے۔ اگر آپ نہیں چاہتے تو میں جاؤں گا ان کے پاس۔ مجھ سے تو وہ ناراض نہیں ہوں گی۔'' خرم نے کہا تو انھوں نے ہونٹ بھینچ کر سر جھکا لیا۔ غالباً خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔

''جب تک میں نہیں جانتا تھا پاپا، میرے اندر بس ایک کمی کا احساس تھا اور وہ بھی کبھی کبھی آپ کی محبتوں میں دب جاتا تھا۔ لیکن جس دن سے مجھے ممی کے بارے میں پتا چلا ہے میں اُس روز سے تڑپ رہا ہوں، بس ایک بار مجھے اُن سے ملا دیں۔'' وہ چھ فٹ کا جوان بچوں کی طرح مچل گیا تھا۔

منیب احمد کو اُسے بہلانے کا کوئی طریقہ سمجھ نہیں آیا تو اُنگلیوں میں دبا سگار ایش ٹرے میں

ڈال کر بولے تھے۔

''گڈ نائٹ بیٹا۔''

خرم ایک دم خاموش ہو گیا اور اُن کے چہرے پر کرب کی لکیریں دیکھ کر اسی خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا تو اس کے بعد بھی منیب احمد کتنی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ اُن کا ذہن اچانک خالی ہو گیا تھا۔ کوئی سوچ تھی نہ کوئی خیال اور شاید سارے احساسات بھی سو گئے تھے، جنھیں ایک سسکتی ہوئی سرگوشی نے جھنجھوڑا تھا۔

''تمھاری قسم منیب احمد تم سے جُدا ہو کر میں مر جاؤں گی۔''

''نہیں۔'' وہ بہت بے قرار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ لیکن اندر جو محشر برپا ہو چکا تھا وہ کسی طرح ختم نہیں رہا تھا۔ تب بہت تھک کر انھوں نے خود کو راکنگ چیئر پر گرا دیا تھا۔

سارا دن آفس کے کام اُسے اتنا نہیں تھکاتے تھے جتنا واپسی کا سفر تھکا دیتا تھا۔ ٹریفک کا شور اور دھوئیں کی کثرت پھر ہر دوسرے موڑ پر ٹریفک کا جام ہو جانا۔ اُسے لگتا تھا جیسے وہ کبھی گھر پہنچ ہی نہیں سکے گی اور جب پہنچ جاتی تھی تو کتنی دیر تک اُس کے کانوں میں ہر قسم کے ہارن گونجتے رہتے تھے۔ بہر حال اس وقت وہ بہت تھکی ہاری گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن جب سامنے نانا ابا کو دیکھا تو ساری تھکن بھول کر بے ساختہ چیخ کے ساتھ بھاگ کر اُن سے لپٹ گئی۔

''کیسا ہے میرا بیٹا؟'' نانا ابا نے اُس کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس اور بہت خوش۔ کیوں کہ مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے، بغیر سفارش کے۔'' اُس نے کھلکھلا کر گردن اکڑائی تو نانا ابا اُس کا کندھا تھپک کر بولے۔

''مجھے پتا ہے میرا بیٹا بہت لائق ہے لیکن بیٹا مجھے تمھارے جاب کرنے سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔''

''نانا ابا پلیز ایسے نہ کہیں۔ میں نے پہلے آپ سے اجازت لی تو تھی۔''

"ہوں۔ اور میں نے تمھاری خوشی کی خاطر۔ خیر یہ بتاؤ آفس کہا ہے۔" نانا ابا نے ابھی بھی اُس کی خوشی کا خیال کر کے دل چسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دور۔ پورا ایک گھنٹہ لگتا ہے جانے میں۔ بس آپ دعا کریں میری پرموشن ہو جائے تو پھر آفس کی طرح سے کنوینس مل جائے گی۔" اُس نے کہا تو اسماء بے ساختہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"ماشاءاللہ چار دن ہوئے جاتے ہوئے اور ابھی پرموشن ہو جائے گی اس کی۔"

"آپ کو کیا پتا۔" وہ خجل سی ہوگئی تھی۔

"ہاں بھئی تمھیں کیا پتا۔" نانا ابا نے فوراً اسماء کو ٹوکا لیکن اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکے جس سے وہ کچھ رُوٹھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ دونوں کو پتا نہیں ہے۔ جہاں بغیر سفارش کے نوکری ملتی ہے وہاں پرموشن بھی جلدی ہوتی ہے۔"

"اچھا جاؤ کھانا گرم کرو۔ تمھارے نانا ابا ابھی گھنٹہ بھر پہلے آئے ہیں اور تمھارے انتظار میں کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔" اسماء نے ٹوکا۔

"ارے تو خواہ مخواہ مجھے باتوں میں لگا دیا۔ بس نانا ابا میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

پھر رات میں وہ دیر تک نانا ابا سے خالہ جان اور اُن کے بیٹے بیٹیوں کا حال احوال پوچھتی رہی۔ جب اسماء نے احساس دلایا تب اُس نے اُٹھ کر پہلے اپنا بستر ٹھیک کیا پھر صبح کے لیے کپڑے نکال کر استری کرنے کھڑی ہوگئی۔ اسماء اور نانا ابا ابھی بھی خالہ جان کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے محسوس کیا کہ باتیں کرتے ہوئے اچانک اُن کی آوازیں دھیمی ہوگئی تھیں۔ تو کچھ متجسس سی ہو کر اُس نے اپنا سارا دھیان اُن کی طرف لگا دیا۔

"تمھاری آپا نے شہریار کے لیے کہا ہے۔ اور مجھے بھی وہی اچھا لگا ہے۔ ماشاءاللہ خوب قد کاٹھ نکالا ہے اُس نے۔ عادت کا بھی اچھا ہے۔ نانا ابا اسماء کو جس انداز سے شہریار کے

بارے میں بتا رہے تھے اس سے وہ سمجھ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور ایسی باتیں اُس کے اندر ہل چل نہیں مچاتی تھیں بلکہ حد درجہ متنفر ہو کر اُس کا دل چاہتا چیخ چیخ کر کہے کہ اُسے شادی نہیں کرنی۔ اُسے دنیا کے سارے مرد زہر لگتے ہیں سوائے نانا ابا کے۔ لیکن اُس کے اندر بے باکی نہیں تھی۔ اس لیے اسماء سے بہت زیادہ قریب ہونے کے باوجود اُس نے کبھی شادی کے موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ اگر اسماء کے منہ سے کبھی کوئی ایسی بات نکلتی تب بھی وہ خاموش ہو جاتی تھی۔ جب کہ اپنے طور پر وہ کبھی شادی نہ کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اور اُس نے سوچ لیا تھا کہ جب اسماء براہ راست اُس سے پوچھے گی تب وہ صاف منع کر دے گی۔ ابھی تو وہ سرگوشیوں میں نانا ابا کے ساتھ جانے اور کیا باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے مزید سننے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ پہلی بات نے ہی اُسے متنفر کر دیا تھا۔ اور اپنے اندر کی سرکشی کو دبانے میں لگی تھی۔ ساتھ خاصے جارحانہ انداز میں کپڑوں پر استری بھی پھیرتی گئی۔ پھر پلگ نکال کر سیدھی اپنے لحاف میں گھس گئی، اور جانے کیا کچھ سوچتے ہوئے سوئی تھی۔

صبح اُس کا اُٹھنے کو بالکل دل نہیں چاہا لیکن نئی جاب تھی اس لیے مجبوراً اُٹھنا پڑا۔ رات کی سوچوں سے ذہن ابھی بھی کچھ منتشر سا تھا۔ ناشتے کے دوران اسماء پتا نہیں کیا کیا کہتی رہی اُس کا جواب بس ہوں ہاں میں تھا۔ اور آفس آ کر کچھ دیر تو وہ ڈیسک کے بغیر ہی کی بورڈ پر اُنگلیاں چلاتی رہی۔ جانے کیوں وہ اتنی ٹینس ہو رہی تھی۔ حالانکہ بہت ساری حقیقتوں کو اب تو وہ تسلیم کرنے لگی تھی۔ اور یہاں تک سوچتی کہ دنیا میں وہ اکیلی تو نہیں ہے جس کے حصے میں کوئی محرومی آئی ہے۔ اور کتنے لوگ ہیں جو محروم ہی محروم ہیں۔ پھر وہ تو اُن سے بہتر ہے۔ ابھی بھی وہ خود کو یہی باور کرا رہی تھی کہ فون کی بیل نے اُسے چونکا دیا۔

"یس۔" اُس نے خاصی بے دلی سے ریسور اُٹھایا تھا۔

"شجیع الحسن تشریف رکھتے ہیں۔" اُدھر سے کسی نے باس کے بارے میں پوچھا تھا۔

"جی نہیں۔ وہ دس بجے آئیں گے۔ اینی میسج؟"

"یس، وہ آئیں تو انھیں کہیے گا مجھے رنگ کر لیں۔" دوسری طرف جانے کون تھا جو اتنے یقین سے بولا تھا مجھے رنگ کر لیں، جیسے وہ اُسے جانتی اور پہچانتی ہو۔ اور وہ بھی بے دھیانی میں

بے ساختہ کہہ گئی۔

"اوکے۔" پھر ریسور رکھ کر اُس نے پہلے کمپیوٹر میں ڈسک لگائی پھر دراز میں سے پیپرز نکال کر ٹیبل پر رکھے تھے کہ شجیع الحسن آگئے۔ اُس نے درمیانی گلاس وال سے انھیں اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے دیکھا پھر اطمینان سے نوٹ بک لے کر اُن کے کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کرنے کے ساتھ ہی کہنے لگی۔

"سر وہ ابھی فون آیا تھا کہہ رہے تھے آپ جیسے ہی آئیں مجھے رنگ کرلیں۔" انھوں نے پہلے ایک اچٹتی نظر اُس پر ڈالی تھی پھر براہِ راست اُسے دیکھ کر بے ساختہ پوچھا۔

"آپ کو؟"

"نو سر۔ مجھے نہیں انھیں۔" اُسے ایک دم اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سٹپٹا گئی۔

"انھیں کا کوئی نام تو ہوگا۔" انھوں نے بتایا تھا۔

"نو سر۔ یس سر۔ آئی مین ضرور ہوگا۔ لیکن انھوں نے بتایا نہیں تھا، یا شاید میں پوچھنا بھول گئی۔ آئی ایم سوری۔" وہ بہت پزل سی آخر میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت طلب کر رہی تھی۔ اور شجیع الحسن جواب تک اپنی نفی کرتے آئے تھے اُن کے اندر اچانک ایک نیا احساس انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر نظریں اُس پر جمی تھیں اور ذہن اپنے آپ اُس کے لیے تشبیہات سوچنے لگا تھا۔

اور وہ پزل تو تھی ہی مزید اُن کے براہِ راست نظروں سے گھبرا سی گئی تو ایک دم خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد شجیع الحسن اپنے آپ چونکے تھے اور اندر ہی اندر خود کو ٹوک کر پوچھنے لگے۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"نو سر۔" اس نے دوبارہ اپنی غلطی دہرانے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اوکے۔" انھوں نے جانے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے اپنے روم میں آگئی اور اپنی غلطی سوچ کر پہلے حیران ہوتی رہی پھر اگلے کام کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔ اور جلد ہی اپنی

کوشش میں کامیاب ہو کر مصروف ہو گئی تھی۔

چھٹی کا دن اب انتہائی بور لگنے لگا تھا۔ ساری رونقیں روبی اپنے ساتھ جو لے گئی تھی۔ یا شاید انھیں نئے احساس نے یوں جھنجھوڑا تھا کہ تنہائی اور خاموشی محسوس ہونے لگی تھی۔ ناشتے کے بعد انھوں نے سوچا کہ وہ نتاشہ اور تانیہ کو بلا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ آجائیں گی تو رونق ہو جائے گی۔ لیکن پھر انھوں نے خود اپنے دوست اذعان کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ روبی کی شادی کے بعد سے اُن کا اُدھر جانا ہی نہیں ہو سکا تھا۔ دو تین بار اذعان اور اُس کی ماما کا بھی فون آچکا تھا، اور انھیں زیادہ ماما کا ہی خیال تھا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہوں اس لیے نتاشہ اور تانیہ کو بلانے کا پروگرام ملتوی کر کے وہ خود تیار ہو کر اذعان کی طرف چلے آئے۔

"میں نے ابھی تمھیں فون کیا تھا۔ دینو بابا نے بتایا تم نکل چکے ہو۔" اذعان نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

"ہاں بس اچانک پروگرام بنا اور فوراً عمل بھی کر ڈالا۔ ویسے تم نے کس سلسلے میں فون کیا تھا۔" انھوں نے آرام سے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہنا تھا کہ تم آرہے ہو، یا میں آؤں۔ اور یہ اچھا ہوا کہ تم آگئے اور اب ذرا پوری طرح خود کو تیار کر لو ماما کا لیکچر سننے کے لیے اور میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ بہت غصے میں ہیں۔" اذعان نے انھیں خبردار کیا تو انھوں نے پوچھا۔

"میرے نہ آنے پر؟"

"جی نہیں۔" اذعان نے اِسی قدر کہا تھا کہ ماما آگئیں۔

"اسلام علیکم ماما۔" وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔ بڑے دنوں بعد آئے۔" ماما کے ہونٹوں پر اُن کی مخصوص نرم سی مسکراہٹ تھی۔

"بس ماما روبی کی شادی کی وجہ سے آفس میں کافی کام رُک گئے تھے۔"

"روبی کیسی ہے۔واپس آگئی۔" ماما نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔کل اُس کا کینیڈا سے فون آیا تھا کہہ رہی تھی ابھی دو ہفتے مزید گھومے پھرے گی۔آپ سنائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے۔" انھوں نے روبی کا بتا کر پوچھا۔ ماما کو جیسے موقع مل گیا۔اذعان کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"یہ لڑکا چاہتا ہی نہیں کہ میں ٹھیک رہوں۔لوگوں کو بیٹیوں کی اتنی فکر نہیں ہوتی ہو گی جتنی اس ایک لڑکے کی مجھے لاحق ہے۔ پتا نہیں اس نے کیا سوچ رکھا ہے۔اس کے ساتھ کے دو دو بچوں کے باپ بن گئے ہیں اور یہ ہے کہ ابھی بھی شادی کا نام نہیں لیتا۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے سر پر سہرا سجانے کی حسرت لیے میں......"

"اللہ نہ کرے۔" وہ فوراً بول پڑے اور اذعان کو دیکھا تو وہ یوں بیٹھا تھا جیسے ان باتوں کا عادی ہو چکا ہو۔

"تم ہی سمجھاؤ اِسے۔ میں تو اب تھک گئی ہوں۔" ماما قدرے خفگی سے اذعان کو دیکھتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں تو اُن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

"مجھے سمجھانے کی فضول کوشش مت کرنا شجیع۔تم جانتے ہو مجھے دنیا کی کسی لڑکی پر اعتبار نہیں ہے۔ دوغلی ہوتی ہیں سب۔ محبت کسی سے کرتی ہیں شادی کسی اور سے۔اور کبھی پیچھے پلٹ کر دیکھتیں بھی نہیں کہ جس کے ساتھ محبت کی آنکھ مچولی کھیلی تھی اُس کا کیا ہوا۔زندہ بھی ہے یا مر گیا۔اتنی ظالم، اتنی سفاک۔میری زندگی میں اگر کوئی ایسی لڑکی آگئی تو میں......" وہ زہر زہر لہجے میں بولتے ہوئے سختی سے ہونٹ بھینچ گیا۔

شجیع الحسن ایک ٹک اُسے دیکھے جارہے تھے۔

"سوری یار۔ پتا نہیں کیوں میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔" کچھ دیر بعد اذعان کو جانے کچھ غلط کہہ جانے کا احساس ہوا، یا شجیع الحسن کی خاموش نظروں سے جھنجھلا گیا تھا جو اُٹھتا ہوا بولا۔

"میری بکواس کو تم کوئی اہمیت مت دینا۔ چلو اُٹھو کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"بے کار تمھارے پاس آ گیا میں۔ اگر نتاشہ کی طرف چلا جاتا تو اتنی سی دیر میں وہ کتنی

خاطر مدارات کر چکی ہوتی اور اس کے بچوں کے ساتھ بھی اچھا وقت گزر جاتا۔" انھیں واقعی افسوس ہو رہا تھا۔

"ارے خاطر مدارات تو میں تمھاری ایسی کروں گا کہ......"

"بس بس......" انھوں نے ٹوک دیا۔ "میں تمھاری باتوں سے ہی سیر ہو گیا ہوں۔"

"کم آن یار۔ تم تو ناراض ہو گئے۔" اذعان انھیں اُٹھنے پر آمادہ نہ دیکھ کر اُن کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"ویسے تمھاری ناراضگی کس بات پر ہے۔ چائے نہ ملنے پر، یا میری بکواس پر؟"

"ان دونوں پر نہیں ہے۔" انھوں نے کہا تو اذعان حیران ہوا۔

"پھر......؟"

"تم ماما کا خیال نہیں کر رہے۔ انھیں دُکھ دے رہے ہو۔ آخر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ ماں ہیں اُن کی ساری خوشیاں ساری آرزوئیں تم سے وابستہ ہیں۔"

"تو میں کب اس سے انکار کر رہا ہوں۔ اُن کی خواہش کے مطابق یعنی جو انھوں نے مجھے بنانا چاہا بن گیا ہوں بس ایک دولہا نہیں بن سکتا۔" اذعان نے گہری سانس کے ساتھ کہا تھا۔

"وہ بھی بن جاؤ، ماما کی خاطر۔ دیکھو، ماں باپ ساری زندگی اولاد کے لیے بہت قربانیاں دیتے ہیں تم اب بچے نہیں ہو جو تمھیں ایک ایک بات سمجھائی جائے۔ ماما نے تمھارے لیے جتنی تکلیفیں سہیں وہ سب تم جانتے ہو پھر انھیں مزید دُکھ کیوں دے رہے ہو۔ اُن کی خوشی کا سامان کیوں نہیں کرتے۔" انھوں نے دھیرج سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"خوشی کا سامان۔ یعنی دلہن کی صورت ایک عدد ڈیکوریشن پیس۔" اذعان سوچتے ہوئے انداز میں جیسے اپنے آپ سے بولا تھا۔

"ڈیکوریشن پیس کیوں؟" انھوں نے ٹوکا۔

"کیوں کہ مجھے تو ضرورت نہیں ہے۔" اذعان بے پرواہی سے کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شجیع الحسن کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے پھر وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''اوکے۔ میں چلتا ہوں۔''

''کہاں......؟'' اذعان ایک دم اُن کے سامنے آ گیا۔

''ظاہر ہے گھر ہی جاؤں گا۔''

''ایسے کیسے جاؤ گے۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں نے چائے اس لیے نہیں بنوائی کہ کھانے کے بعد پیئں گے۔ اور اس کے بعد پتا ہے میرا کیا پروگرام ہے۔''

''تمھارا جو بھی پروگرام ہو مجھے اس میں شامل مت کرو۔'' اُن کے رُوٹھے انداز پر اذعان چڑ گیا۔

''کیا سمجھتے ہو تم۔ میں تمھاری خوشامد کروں گا۔ ہرگز نہیں۔ ارے میں نے کبھی اپنے......''

''رُک کیوں گئے کہو۔'' انھوں نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر اُسے دیکھا۔ تب ہی ملازم کھانے کے لیے بلانے آ گیا۔ انھیں بھوک نہیں تھی لیکن جانتے تھے کہ ماما اس طرح نہیں جانے دیں گی اس لیے بغیر کسی پس و پیش کے فوراً چل پڑے۔

ماما ڈائینگ روم میں موجود تھیں اور اذعان اُن کے کچھ دیر بعد آیا تھا اور بیٹھتے ہی کہنے لگا۔

''ماما شجیع بھی تو ہے۔ اور اب مزید اس پر کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے پھر آپ اس کی شادی کا کیوں نہیں سوچتیں۔''

''میں دونوں کا سوچتی ہوں۔'' ماما نے سالن کی ڈش اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر پہلے آپ اس کی شادی کریں۔ کیوں کہ روبی کے جانے سے یہ نہ صرف اکیلا ہو گیا ہے بلکہ مجھے کچھ خبطی بھی لگنے لگا ہے۔ ایسا نہ ہو کسی دن......''

''اذعان......'' ماما نے سخت تنبیہی لہجے میں ٹوکا تو وہ کندھے اُچکا کر اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

''ہاں شجیع اب تم نے کیا سوچا ہے بیٹا۔'' قدرے توقف سے ماما نے اچانک انھیں مخاطب کر کے پوچھا تو فوری طور پر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انھیں کیا جواب دیں۔ کچھ سٹپٹا کر اذعان کو دیکھا تو وہ شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ماما تم سے کچھ پوچھ رہی ہیں۔ شرماؤ نہیں بتا دو۔ اگر کوئی ہے تو......''

''ک۔ کیا مطلب۔ وہ مزید بوکھلا گئے۔ جس پر اذعان زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اس کا مطلب ہے کوئی ہے......''

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔'' انھوں نے ماما کا خیال کر کے انجان بننے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن اُن کے اندر کہیں دھیرے دھیرے کوئی ہے کوئی ہے کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ اور واپسی کے سفر میں وہ ایک بار پھر اس کے لیے تشبیہات سوچنے لگے تھے۔

وہ کپڑے دھونے کے بعد سارا گھر دھونے کا ارادہ کر رہی تھی کہ پڑوس سے زینی آ گئی جسے دیکھ کر اُسے گھر دُھلائی کا کام اگلے ہفتے تک ملتوی کرنا پڑا۔ کیوں کہ زینی کے ساتھ اس کی نشست ایک آدھ گھنٹے کی ہو ہی نہیں سکتی تھی اور آج تو وہ اتنے دِنوں بعد آئی تھی۔ جس کا اُس نے چھوٹتے ہی شکوہ کیا۔

''بڑے دنوں بعد آئی ہو......''

''جناب میں بڑے دنوں بعد نہیں آئی تم بڑے دنوں بعد دستیاب ہوئی ہو۔ تم نے جب سے جاب شروع کی ہے میرے گھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔'' زینی نے اُلٹا اُسے لتاڑنا شروع کیا تو وہ فوراً مظلوم بن گئی۔

''کیا کروں۔ صبح کی نکلی شام میں آتی ہوں اور آج چھٹی کا دن دیکھو ابھی کپڑے دھو کر فارغ ہوئی ہوں۔ ابھی اور کتنے کام رکھے ہیں۔''

''ارے کام بھی کبھی ختم ہوتے ہیں۔'' زینی اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''خیر چھوڑو یہ بتاؤ جاب کیسی جا رہی ہے۔''

''زبردست۔ بس آنے جانے کی پرابلم ہے۔ دو بسیں بدلنی پڑتی ہیں۔''

"تم سے کہا کس نے تھا اتنی دور جانے کو۔ یہیں قریب ہی کسی اسکول میں ٹرائی کر لیتی۔"
زینی کے مشورے پر وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"اسکول والے تنخواہ کیا دیتے ہیں۔"

"ایک اکیلے بندے کی دال روٹی بھی نہ چلے۔" زینی کہہ کر خود ہی ہنسی تھی۔

"پھر......؟"

"پھر یہ کہ میں تمھیں ایک خوش خبری سنانے آئی ہوں۔" زینی نے اس موضوع سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"جلدی سناؤ۔ بڑے دن ہوئے اچھی خبر سنے ہوئے۔" اُس نے بے مہری کا مظاہرہ کیا۔

"آپا کی بات پکی ہوگئی ہے۔" زینی نے بتایا تو وہ واقعی خوش ہوگئی۔

"سچ۔ بہت مبارک ہو۔ شادی کب ہے؟"

"اگلے مہینے آٹھ تاریخ کو......"

"آٹھ تاریخ۔ کوئی زیادہ دن تو نہیں ہیں۔ ہائے ایمان سے کتنا مزہ آئے گا۔ میں کل ہی اپنا سوٹ لیتی آؤں گی پھر تم سی دینا۔" اُس نے کہا تو زینی اُچھل پڑی۔

"میں کیوں سی دوں گی۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے نا۔" اس نے مسکین سی شکل بنائی تھی۔

"تو میرے پاس کون سا بہت وقت ہے۔ امی نے پہلے ہی اتنے کام میرے سر ڈال دیئے ہیں اور میں تمھارے پاس آئی ہی اس لیے ہوں کہ تم میرا ساتھ دو۔"

"میں بہت خوشی سے تمھارا ساتھ دیتی لیکن میرا آفس......"

"چھٹی لے لو ایک ہفتے کی۔ آرام سے سارے کام ہو جائیں گے۔" زینی نے فوراً کہا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

"چھٹی، ایک ہفتے کی۔ ابھی ایک مہینہ نہیں ہوا جاب کو۔ باس ہمیشہ کے لیے چھٹی کر دیں گے۔ اب خدارا یہ مت کہہ دینا کہ اور جاب ڈھونڈ لینا، کیوں کہ دوبارہ ایسی جاب تو

شاید مل جائے لیکن ایسا آفس ایسا ماحول اور ایسے باس تو ناممکن ہے۔"

"باس کیسے ہیں......؟" زینی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے بازو میں چٹکی کاٹی تو وہ چیخ پڑی۔

"خبردار جو کچھ غلط سوچا تو۔ میں اُن کے اخلاق اور کردار کی تعریف کر رہی ہوں۔"

"اور کیا رہ جاتا ہے۔ ہاں پرسنالٹی۔ وہ بھی بتا دو۔" زینی مزید چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔

"میری بلا سے خواہ کتنے بھی ہینڈسم ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے بہت ہینڈسم ہیں۔ سپرڈ ہیں یا اَن سپرڈ۔" زینی کو اُسے چھیڑنے میں مزہ آ رہا تھا۔ اور اس بار وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"دیکھو زینی تم اچھی طرح جانتی ہو میں ایسی باتیں مذاق میں بھی پسند نہیں کرتی۔ تم بے شک مجھے گالیاں دے لو لیکن کسی نام کو میرے ساتھ نتھی مت کرو۔ نفرت ہے مجھے مردوں سے۔"

"اوہو۔ تم تو ناراض ہونے لگیں۔ چلو چھوڑو اس موضوع کو اور مجھ سے چائے پانی کا پوچھو۔" زینی نے اُس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر فوراً مصالحانہ کوشش کی تو وہ ایسے ہی منہ پھلائے ہوئے اُٹھ کر کچن میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد زینی بھی اُس کے پیچھے چلی آئی۔ پھر دونوں نے وہیں کھڑے کھڑے چائے پی کیوں کہ ساتھ میں وہ مٹر بھی چھیلنے لگی تھی۔ اور باتیں تو اُن کی کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ اسماء نے کتنی بار پکار کر کہا کہ برآمدے میں آ کر بیٹھ جاؤ لیکن اُس نے سنا ہی نہیں۔

شام اُتر رہی تھی۔ اُس نے باتوں کے ساتھ کھانا بھی تیار کر لیا اور زینی سے بہت کہا کہ وہ کھانا کھا کر جائے لیکن اُس کے گھر سے بلاوا آ گیا تھا اس لیے وہ اگلے وقت پر ٹال کر چلی گئی۔

صبح حسبِ سابق وہ بہت عجلت میں تیار ہوئی تھی۔ اور ایسے ہی جلدی جلدی میں ناشتا کر کے نکلی تھی۔ اگر بس بدلنے کا چکر نہ ہوتا تو شاید اُسے کچھ وقت مل جاتا لیکن اب مجبوری تھی اس لیے اسماء کے بار بار ٹوکنے کو بھی اُسے نظر انداز کرنا پڑتا تھا۔ اور آخر میں اُسے اطمینان دلانے کے لیے بس اتنا کہتی آفس میں کھانے کو بہت کچھ مل جاتا ہے، فکر نہ کیا کریں۔ پھر باہر آ کر اپنی ہی بات پر ہنستی تھی۔ اس وقت وہ برائے نام ناشتا کر کے نکلی تھی۔ اور جب پہلی بس چھوڑ کر دوسری بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تو سوچا سینڈوچ لے کر بیگ میں ڈال لے ورنہ دوپہر تک بھوکا رہنا پڑے گا۔ سامنے بیکری نظر آ رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے سینڈوچ لے لیے اور بیگ میں رکھتے ہوئے واپس اُسی جگہ پر آ کر کھڑی ہوئی تھی کہ گاڑی کا دروازہ کھلنے کے ساتھ اُسے پکارا گیا تھا۔

"مس عروبہ......"

وہ بیگ بند کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ آواز پر چونک کر سر اُونچا کیا اور گاڑی میں شجیع الحسن کو دیکھ کر بے اختیار بولی تھی۔

"یس سر......"

"بیٹھ جائیں۔" اُن کے لہجے میں تحکم نہیں تھا بلکہ یوں جیسے آفس میں اُس سے مخاطب ہوں اور وہ اُن کی بات ماننے پر مجبور۔"

"آپ کی رہائش یہاں ہے؟" اُس کے بیٹھنے کے بعد شجیع الحسن نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"نو سر۔ یہاں سے میں بس چینج کرتی ہوں۔"

"ڈائریکٹ کوئی بس نہیں جاتی؟"

"نو سر۔ اور اب تو میں عادی ہو گئی ہوں۔ نو پرابلم۔" وہ اعتماد سے مسکرائی تھی۔ شجیع الحسن نے ویو مرر میں ایک نظر اُسے دیکھا پھر قدرے توقف سے بولے تھے۔

"آپ نے شاید ناشتا نہیں کیا۔ کچھ کھانا چاہیں تو کھا لیں۔" وہ سمجھ گئی انھوں نے اُسے

بیکری سے نکلتے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے بڑے آرام سے بولی۔

"یہ تو میں نے یونہی احتیاط لے کر رکھ لیے ہیں ورنہ ناشتا میں کر چکی ہوں۔ اور سر آج آپ اتنی جلدی آفس کیسے جا رہے ہیں آئی مین آپ تو......"

"دس بجے آتا ہوں۔" اس کے جھجکنے پر انھوں نے مسکرا کر کہا۔ وہ بس سر ہلا سکی۔

"فاروقی صاحب چھٹی پر گئے ہیں اس لیے۔" انھوں نے خود ہی مبہم سا سبب بتایا تو وہ خود کو مزید بولنے سے باز رکھنے کی خاطر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی میں بیٹھ کر رواں ٹریفک کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ صبح کا وقت اُمید کی کرنیں بکھیرتا ہوا۔ روزگار کے لیے جاتے ہوئے لوگوں کے چہرے کتنے فریش لگ رہے تھے۔ اور دن بھر آفس میں مغز ماری کے بعد شام میں گھروں کو لوٹتے ہوئے انہی چہروں پر کیسی تھکن ہو گی۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتے، بسوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر سوچنے لگی تھی کہ سگنل پر گاڑی رُکنے سے جہاں اُس کی سوچیں منتشر ہوئیں وہاں ساتھ جو گاڑی آ کر رُکی تھی اس میں بیٹھے شخص نے اُس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ وہ بہت غور سے دیکھنے لگی، چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا تھا۔

"کون ہے۔" وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی۔ تب ہی سگنل آن ہو گیا۔ وہ گاڑی پہلے آگے بڑھ گئی تو وہ کچھ مضطرب سی ہو کر گاڑی کا پچھلا حصہ یوں دیکھنے لگی جیسے اُس کے ہاتھ سے کوئی قیمتی لمحہ پھسل گیا ہو۔

"کیا بات ہے؟" شجیع الحسن نے اُس کی بے چینی محسوس کر کے پوچھا۔

"وہ......" اُس نے بے دھیانی میں آگے جاتی گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

"منیب احمد......" ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔ پھر بے اختیار شجیع الحسن کا بازو تھام کر بولی۔

"پلیز پلیز سر گاڑی تیز چلائیں۔ مجھے اُن کے پاس جانا ہے۔ وہ......وہ......وہ۔" جس گاڑی کی طرف اشارہ کرنا چاہتی تھی وہ جانے کس سمت نکل گئی تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر

ادھر سامنے دور تک دیکھنے لگی۔ جب کہ شجیع الحسن کے بازو پر اُس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔

''ریلکس، ریلکس پلیز۔'' انھوں نے آہستگی سے اُس کے ہاتھ کو چھوا تو وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ فوراً اُن کا بازو چھوڑ کر نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''سوری، ویری سوری۔''

''نیور مائنڈ۔'' انھوں نے قصداً اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا پھر کہنے لگے۔

''پتا نہیں۔'' مجھے پوچھنا چاہیے یا نہیں۔ کون تھا جسے دیکھ کر آپ اتنی پریشان ہوگئیں؟'' اگر اُس سے بے اختیاری حرکات سرزد نہ ہوئی ہوتیں تو وہ کوئی نہیں کہہ کر بات ختم کر دیتی اور اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔

''سوری! اگر آپ بتانا نہیں چاہتیں تو سمجھ لیں میں نے کوئی سوال اُٹھایا ہی نہیں۔'' وہ اُسے شش و پنج میں محسوس کر کے ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔ اس کے بعد آفس تک اُسے یوں نظرانداز کر دیا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔

''میرے خدا......'' اپنی چیئر پر بیٹھتے ہوئے اُس نے جیسے طویل مدت بعد سانس لی تھی۔

اور پھر سارا دن اُس کا یونہی گزرا۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوسکا تھا۔ اس پر شجیع الحسن کے مسلسل اگنور کر دینے سے وہ اپنے آپ میں گلٹی فیل کرنے لگی تھی۔ کوئی اور شخص ہوتا تو ایک کے بعد دوسری غلطی پر تو ضرور سرزنش کرتا جب کہ انھوں نے ٹوکا تک نہیں۔ جیسے اوّل روز انجان بن گئے تھے۔ اور وہ سارا دن یہی سوچتی رہی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جیسے سرِ راہ اُس نے اتنی باتیں سنائی تھیں۔ اور ابھی بھی ایک تو اُس کا ذہن منیب احمد میں اُلجھا تھا دوسرے شجیع الحسن کا رویہ پریشان کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُس کے نزدیک مرد صرف ظالم اور جابر تھا اور بس۔ اس سے ہٹ کر اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اُس کی پریشانی ہر پل بڑھتی جارہی تھی، کہ گلاس وال کے اُس طرف بیٹھا وجیہہ شخص اپنے ہر عمل سے اُس کی سوچوں کی نفی کر رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ اس کا موازنہ منیب احمد سے کرنے لگی، جنھیں آج اُس نے پہلی بار

دیکھا تھا۔ اُس سے پہلے اُس نے اسماء کی الماری میں اُن کی تصویر دیکھی تھی اور کیوں کہ درمیان میں بیس برس تھے اس لیے پہلی نظر میں وہ انھیں پہچان نہیں سکی تھی اور شاید پہچانتی تو اب بھی نہیں تھی اس کے لیے تو اُسے اسماء سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔

''اور اگر اب بھی امی نے بتانے سے گریز کیا تو میں نانا ابا سے پوچھوں گی۔ اس شام وہ یہ تہیہ کر کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

منیب احمد چاہتے تھے کہ خرم کی شادی کر کے گھر میں بہو لے آئیں تاکہ گھر میں کچھ تو رونق ہو۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے جب بھی خرم سے بات کی، وہ ٹال گیا۔ جانے اُس نے اپنے بارے میں کیا سوچ رکھا تھا، حالانکہ وہ اپنی ہر بات ہر پروگرام انھیں ضرور بتاتا تھا۔ اس معاملے میں بھی اُن کے خیال میں وہ رازداری نہیں برت سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ شروع سے اُن کے ساتھ خاصا فرینک تھا۔ اس لیے انھیں اس کی طرف سے کوئی خدشہ نہیں تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے گا جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔ البتہ اُس کی ٹال مٹول اب انھیں کھلنے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بہت اُصول پسند تھے، اور ہر کام اُس کے وقت پر کرنا چاہتے تھے۔ اور خرم نہ صرف تعلیم مکمل کر چکا تھا بلکہ بزنس میں ایک سال اُن کے ساتھ رہنے کے بعد اب اپنے الگ آفس میں بھی سیٹ ہو چکا تھا۔ تو اس حساب سے اگلا مرحلہ اس کی شادی کا تھا، جس پر سنجیدگی سے بات کرنے کے لیے انھوں نے اس وقت اُسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور اُس کے بیٹھتے ہی بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔

''بیٹا، میں تمھاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تمھیں اگر کوئی لڑکی پسند ہو تو بتا دو تاکہ بات آگے بڑھائی جاسکے۔''

''لڑکی پسند ہو تب بھی میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' خرم نے انھیں سنجیدہ دیکھ کر اس بار صاف جواب دے دیا تھا۔

''کیوں......''

"وجہ آپ جانتے ہیں پاپا۔ پھر کیوں بار بار اصرار کرتے ہیں۔" خرم نے کہا تو وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔

"نہیں۔ میں نہیں جانتا تم کس وجہ سے انکار کر رہے ہو۔"

"میں انکار نہیں کر رہا۔ انتظار کر رہا ہوں اُس دن کا جب ممی آئیں گی اور اُن کے بعد ہی اس گھر اور میری زندگی میں کسی دوسری عورت کی آمد ممکن ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔" خرم کے حتمی انداز پر پہلے اُن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی پھر جیسے زچ ہو کر بولے تھے۔

"بیٹا، میں کہاں سے لاؤں تمھاری ممی کو۔ اتنا تو تلاش کر چکا ہوں۔ اور اب تو میں یہ کہوں گا کہ وہ......"

"نہیں پاپا پلیز۔ خرم نے فوراً ٹوک دیا۔ کوئی غلط بات منہ سے نہیں نکالیے گا۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور آئیں گی۔

"اتنے برس بیت گئے بیٹا۔"

"تو ہم یہاں کب تھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمھارے تایا ابا کا وہی گھر ہے۔ وہ وہاں آسکتی تھیں۔ اُن سے پوچھتیں تمھارے بارے میں میرے بارے میں اور نہ آنے کا مطلب......؟" اس بار وہ خود ہی خاموش ہو گئے۔ پھر اچانک یاد آنے پر کہنے لگے۔

"ہاں، ایک جگہ سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن......؟"

"لیکن۔ لیکن کیا پاپا۔ بتائیں نا کہاں سے معلوم ہو سکتا ہے۔" خرم نے بے صبری سے اُن کے ہاتھ تھام کر ہلائے تو وہ گہری سانس کھینچ کر کہنے لگے۔

"تمھاری خالہ۔ لیکن وہ یہاں نہیں رہتیں۔ سکھر میں ہوتی ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہیں اور چلی گئیں ہوں۔ اور اگر سکھر میں ہی ہوں تب بھی میرے پاس اُن کا ایڈریس وغیرہ نہیں ہے البتہ معلوم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ سکھر کوئی اتنا بڑا شہر نہیں ہے۔"

"پھر تو پاپا ہم صبح ہی چلیں گے۔" خرم نے فوراً کہا۔

"دھیرج بیٹا دھیرج۔ اتنی بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔ جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں کچھ دن اور رُک جاؤ۔ میں پہلے کسی کو بھیج کر معلوم کروا لوں۔ اس کے بعد ہم چلیں گے۔" منیب احمد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا معلوم کروائیں گے آپ......؟"

"تمھاری خالہ کے بارے میں کہ وہ وہاں ہیں بھی کہ نہیں......"

"ضرور ہوں گی اور ممی بھی اُن کے ساتھ ہوں گی۔" خرم نے کسی چھوٹے بچے کی طرح مچل کر کہا۔ منیب احمد خاموش رہ کر جانے کیا سوچنے لگے تو قدرے رُک کر خرم انھیں پکار کر بولا۔

"پاپا! میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا، آپ صبح ہی کسی کو بھیج دیں۔"

"ہوں۔" منیب احمد نے اُسی پُرسوچ انداز میں سر ہلا دیا۔

"پھر ہم دونوں جا کر ممی کو لے آئیں گے۔ آپ کو پہلے خالہ جان کا خیال کیوں نہیں آیا......؟"

"بس بیٹا۔ اتنے برس بیت گئے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ تمھارے نانا ابا کس محکمے میں ملازم تھے ورنہ وہاں سے اُن کے بارے میں معلوم کرتا۔ گو کہ انھیں ریٹائر ہوئے عرصہ ہو گیا ہو گا پھر بھی معلوم ہو سکتا تھا۔ اور تمھاری خالہ کا بھی بس ابھی اچانک خیال آیا ہے۔ دعا کرو وہ مل جائیں۔"

"انشااللہ ضرور مل جائیں گی۔" خرم بے چین ہو گیا تھا۔

"پھر ممی کے آنے پر تو تم شادی سے انکار نہیں کرو گے نا" منیب احمد نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا۔

"انکار تو میں اب بھی نہیں کر رہا پاپا۔ بس ممی آجائیں پھر آپ اُن کے ساتھ تایا ابا کے گھر جایئے گا میرا پرپوزل لے کر۔" خرم نے کہا تو منیب احمد نے چونک کر اُسے دیکھا تھا۔

"کیا مطب......؟"

"پاپا وہ شبنم ہے نا......" خرم قدرے جھینپنے انداز میں سر کھجاتا ہوا بولا۔

"شبنم۔" منیب احمد اُسے یوں دیکھے گئے جیسے پتا نہیں اُس نے کیا کہہ دیا ہو۔

"کیوں پاپا؟ آپ کو پسند نہیں ہے۔" خرم اُن کے انداز سے ہی سمجھا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے بیٹا۔" منیب احمد سنبھل نہیں پارہے تھے۔

"پھر......؟"

"تمھاری ممی شاید پسند نہیں کریں گی......"

"کیوں......؟"

"اس لیے کہ......" منیب احمد ایک دم خاموش ہو گئے۔ پھر قدرے توقف سے کہنے لگے۔ "اگر تم شبنم کے لیے اتنے سنجیدہ ہو تو پھر تمھیں اپنی ممی کے آنے سے پہلے شادی کر لینی چاہیے۔"

"نہیں پاپا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔"

"تو پھر شبنم کا خیال چھوڑ دو۔ کیوں کہ تمھاری ممی ہرگز نہیں مانیں گی۔ گو کہ اس میں شبنم کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ ہے تو اُس عورت کی بیٹی جس نے تمھاری ممی کے ساتھ......" منیب احمد ایک دم حقیقت بتانے پر آمادہ ہو کر اُس کے سامنے پھر سے اپنی کہانی دہرانے لگے تھے۔ ورنہ تو یہ کہہ کر بری الذمہ ہو گئے تھے کہ معمولی سے جھگڑے کے بعد اُس کی ممی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

یہ نہیں تھا کہ اُس نے کبھی اسماء سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا ہی نہیں تھا، جب وہ چھوٹی تھی اور پہلے ہی دن اسکول سے گھر آئی تو اُس نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"امی۔ میرے پاپا کہاں ہیں۔" اسماء شاید اس سوال کے لیے پہلے ہی تیار تھی جب ہی بڑے آرام سے بولی تھی۔

"تمھارے پاپا یہاں نہیں ہیں بیٹا۔ وہ لندن میں ہیں۔"

"کیوں۔ کب آئیں گے......؟"

"ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے گئے......؟"

میں پاپا کو خط لکھوں گی۔

پاپا مجھے اچھے اچھے کھلونے بھیجیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے سوالوں میں اضافہ ہوتا گیا تھا اور اسماء ہر طرح سے اُسے بہلاتی رہی تھی۔ پھر جب وہ بہلاوؤں کی عمر سے نکلی تو اُسے اسماء پر بہت غصہ آیا تھا کہ وہ اُس سے جھوٹ کیوں بولتی ہے۔ اور تب پہلی اور شاید آخری بار اُس نے اسماء کے سامنے یوں زبان چلائی کہ بدتمیزی کی حد کراس کر گئی تھی۔ جس پر اسماء اتنا روئی تھی کہ پھر اُسے چپ کراتے کراتے وہ نہ صرف خود روئی بلکہ یہ عہد بھی کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اپنے باپ کا نام بھی زبان پر نہیں لائے گی۔ اور واقعی اُس نے پھر کبھی اسماء سے اپنے پاپا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا البتہ اپنے طور پر اُس نے بہت کچھ فرض کر لیا تھا کہ اُس کا باپ ظالم و جابر شخص ہوگا جس نے اُس کی ماں پر ظلم توڑے اور پھر اُسے گھر سے نکال دیا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

اصل حالات اُسے معلوم نہیں تھے۔ اور اُس نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی اور ابھی بھی اُسے حالات جاننے سے دلچسپی نہیں تھی۔ کوئی اور ہی جذبہ تھا جو منیب احمد کو دیکھ کر یوں بیدار ہوا تھا کہ وہ ہر صورت اُن تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے اب اُس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اسماء سے پوچھے۔ گو کہ اب وہ بڑی اور سمجھ دار ہو گئی تھی لیکن اُس کے اندر ابھی بھی وہی خوف تھا کہ منیب احمد کا نام لینے پر اسماء اُسی طرح رونے لگے گی۔ اور اُس کے آنسوؤں سے خائف ہو کر وہ ایک بار پھر اُس سے وہ عہد کر بیٹھے گی اس لیے کتنے دن تو وہ خود کو تیار کرتی رہی اس کے بعد بھی بہت ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔

"امی! مجھے پاپا کے بارے میں بتائیں۔" اسماء نے چونک کر اُسے دیکھا تھا پھر نظریں چرا کر پوچھا تھا۔

"کیا بتاؤں......؟"

''زیادہ نہیں۔ بس اتنا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے......؟'' اُسے کچھ حوصلہ ہوا تھا۔ فوراً اپنے بیڈ سے اسماء کے بیڈ پر آ گئی اور اُس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔

''اب میں بچی نہیں ہوں امی۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میرا باپ کیسا آدمی تھا۔''

''وہ اتنے بُرے نہیں تھے۔'' اسماء بے اختیار کہہ کر خاموش ہو گئی۔ پھر قدرے توقف سے اس نے اپنی زندگی کے وہ چند سال جو منیب احمد کے گھر میں گزارے تھے اُس کے سامنے رکھ دیئے۔ آخر میں کہنے لگی۔

''میں اُس رات تمھارے نانا ابا کے پاس آ گئی تھی۔ اور انھیں میں نے قسم دی تھی کہ اگر انھوں نے میرے بارے میں منیب احمد کو بتایا تو میں سچ مچ جان دے دوں گی۔ اور مجھے اُمید تو نہیں تھی کہ منیب احمد میرے پیچھے آئیں گے کیوں کہ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ میں اُن کی زندگی اور ان کے گھر سے نکل جاؤں تا کہ وہ صوفیہ سے شادی کر سکیں۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ اگلی صبح ہی ابا کے پاس آئے تھے۔ جانے خرم کو میرے حوالے کرنے آئے تھے، یا یہ دیکھنے کہ میں ابا کے پاس ہوں، یا واقعی اپنی زندگی سے کھیل گئی ہوں۔ بہر حال ابا میری قسم سے مجبور تھے۔ جو انھوں نے یہ ظاہر ہی نہیں کیا کہ میں اُن کے پاس ہوں اور منیب احمد باہر ہی سے لوٹ گئے تھے۔''

''پھر میرے، بہت مجبور کرنے پر ابا نے وہ گھر بیچ دیا۔ اور ہم یہاں آ گئے۔ کچھ عرصے بعد تم پیدا ہوئیں تو ابا نے کہا کہ وہ منیب احمد کو اطلاع دیتے ہیں۔ شاید انھیں یہ اُمید تھی کہ بیٹی کا سن کر وہ مجھے طلاق دینے کا خیال چھوڑ دیں گے۔ پھر اُن کے خیال میں صوفیہ سے شادی کے بعد وہ اُس جنونی کیفیت سے بھی نکل آئے ہوں گے۔ اس لیے اُس گھر میں نہ سہی لیکن میرے لیے الگ گھر کا انتظام ضرور کر دیں گے۔ اور برابری کی سطح پر دونوں بیویوں کی ذمہ داری نبھائیں گے۔ اور میں نے اگر ہامی بھری بھی تھی تو خرم کی وجہ سے کیوں کہ جذبات میں آ کر میں نے اُسے اُن کے پاس چھوڑ تو دیا تھا لیکن......'' خرم کے نام سے ہی اسماء کی مامتا تڑپ اُٹھی تھی، آواز بھرا گئی اور آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔ اور وہ جو گم صم سی حالت میں اسماء کو بولتے ہوئے سن رہی تھی اس کے رونے سے چونکی ضرور لیکن ٹوکا نہیں اور گہری سانس کھینچ کر اپنے آپ سے بولی تھی۔

''میرا بھائی بھی ہے۔''

''ہاں۔ اب تو ماشا اللہ جوان ہو گا۔ اور پتا نہیں کیسا ہو گا۔ اگر صوفیہ صحیح معنوں میں اُس کی ماں بنی ہو گی تو......'' اسماء کا انداز سوچتا ہوا تھا جیسے نظروں میں چھوٹا سا بچہ سمایا ہو۔

''تو کیا پاپا نے شادی کر لی تھی......؟'' اُس نے اسماء کی بات کاٹ دی تھی۔ ''نانا ابا گئے تھے اُن کے پاس......؟''

''ہاں۔ لیکن وہ نہیں ملے۔ اُن کی بھابھی جان نے بتایا کہ وہ صوفیہ سے شادی کر کے باہر چلے گئے ہیں اور خرم کو بھی ساتھ لے گئے ہیں جس سے ابا بھی مایوس ہو گئے تھے۔''

''پھر۔ پھر وہ آئے نہیں۔ میرا مطلب ہے اتنے برس بیت گئے۔ درمیان میں کبھی تو آئے ہوں گے۔'' اُس نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔

پتا نہیں بیٹا۔ آئے بھی ہوں گے تو ہمیں نہیں معلوم۔ کیوں کہ تمھارے نانا ابا دوبارہ کبھی اُن کے بھائی کے گھر نہیں گئے البتہ اپنا ایڈریس دے آئے تھے۔ اگر منیب احمد آنا چاہتے تو آ سکتے تھے لیکن شاید انھوں نے چاہا ہی نہیں۔ اسماء آزردگیوں میں گھر گئی تھی۔

''اور اب اگر چاہیں گے بھی تو......'' وہ ہنوز اپنے خیال میں گھر کر جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ ایک دم ہونٹ بھینچ گئی۔ پھر اپنی ہتھیلیوں سے اسماء کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کو رونا نہیں چاہیے۔ اُن کے بغیر ہم مر تو نہیں گئے۔ البتہ اُن کے ساتھ ہوتے تو مر جاتے۔''

''ایسے نہیں کہتے بیٹا۔''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے کبھی اُن کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ چلیں اب آپ سو جائیں۔'' وہ اسماء کے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''اور ہاں صبح مجھے جلدی اُٹھائیے گا۔ آج بھی دیر ہو گئی تھی۔''

''اس لیے کہ سوتی دیر سے ہو۔ جلدی سوؤ گی تو جلدی اُٹھو گی۔'' اسماء نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا تو وہ لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آ گئی۔ لیکن نیند کا کہیں نام نہیں تھا۔ کیوں کہ ذہن

سارے حالات وواقعات کو نئے سرے سے سوچنے لگا تھا۔ حالانکہ کوئی بات اُس کے سامنے نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ یوں روئی جیسے اپنی آنکھوں سے اسماء کو منیب احمد کے سامنے گڑگڑاتا اور اُن کی منتیں کرتے دیکھا ہو۔

اسماء پتا نہیں سوگئی تھی، یا اُس پر یہی ظاہر کر رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا اُسے اُٹھا کر بتائے کہ اُس نے کچھ دن پہلے منیب احمد کو دیکھا تھا۔ وہ اسی شہر میں ہیں اور یہ کہ وہ ایک بار ضرور اُن کے پاس جائے گی۔ اُن سے کچھ مانگنے نہیں بلکہ یہ بتانے کہ اُن کے بغیر اسماء اور وہ مر نہیں گئیں۔ لیکن پھر اُس نے سوچا وہ پہلے منیب احمد سے مل لے اس کے بعد اسماء کو بتائے گی۔

شجیع الحسن کی نظریں بار بار گلاس وال سے اُدھر بھٹک کر مایوس لوٹ رہی تھیں۔ گیارہ بج رہے تھے اور وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اور عجیب بات تھی کہ وہ بار بار یہی سوچ رہے تھے کہ وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں۔ ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہوسکتا ہے آج وہ آئے ہی نا۔ اور نہ آنے کی کئی وجوہ ہوسکتی تھیں۔ بیماری یا کوئی ضروری کام۔ لیکن وہ سوچتے تب نا۔ وہ تو بس منتظر تھے۔ محسوس کی جانے والی آہٹ پر بھی چونک کر دیکھ رہے تھے، اور اپنے آپ پر حیران بھی ہو رہے تھے کہ اُن کا دل کبھی یوں بے اختیار تو نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی سوچیں بے لگام ہوئیں تھیں۔ اب تو ہر پل بس اُس کا خیال تھا۔ حالانکہ اُس کی طرف سے کوئی ایسی بات ہی نہیں ہوئی تھی نہ ہی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ متوجہ کرنے کے فن سے آگاہ تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی اور خود اپنے آپ سے بھی بے نیاز سی لگتی تھی۔ شاید اُس کی یہی ادا انھیں بھائی تھی، یا پھر اُس کی ذات میں کچھ ایسے اسرار تھے جنھیں کھوجنے کو دل مچلنے لگتا تھا۔

''میرے خدا۔'' ساڑھے گیارہ بجے انھوں نے بہت تھک کر چیئر کی بیک سے کمر لگائی تھی کہ وہ آ گئی۔ سیدھی اُن کے کمرے میں آئی تھی۔ اور وہ جو شدت سے اُس کے منتظر تھے اُسے دیکھتے ہی اُن کی پیشانی پر شکنوں کا جال بن گیا اور قدرے سخت لہجے میں بولے تھے۔

''یہ آپ کے آنے کا وقت ہے۔''

''سوری سر۔'' وہ سر جھکا کر بس اسی قدر بولی تھی۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اُسی پل فون کی بیل بج اُٹھی۔ کچھ ناگواری سے انھوں نے ریسور اُٹھاتے ہوئے اُسے سے کہا۔

''اِٹس آل رائٹ۔''

''تھینک یو۔'' وہ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تو اُس کے پیچھے دیکھتے ہوئے وہ ماؤتھ پیس میں بولے تھے۔

''یس، شجیع الحسن اسپیکنگ۔''

''کہاں ہو یار۔ اُس دن کے بعد سے غائب ہی ہوگئے۔'' دوسری طرف اذعان تھا۔ چھوٹتے ہی شکوہ کیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے تھے۔

''ہاں آج کل میں خود اپنے آپ کو بھی دستیاب نہیں ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے میرا خیال ٹھیک تھا۔ کون ہے؟'' اذعان نے شوخی سے پوچھا تو وہ چونک گئے۔

''کون۔ کیا مطلب ہے تمھارا......؟''

''بس اب مزید چکر مت دو اور سیدھے سیدھے مجھے ملواؤ اُس سے۔ اور خبردار جو کہا کس سے۔''

''شٹ اپ تو کہہ سکتا ہوں۔'' انھوں نے مسکرا کر کہا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ میں کون سا شٹ اپ ہو جاؤں گا۔'' اذعان نے کہا تو اُن کی مسکراہٹ ہلکی سی ہنسی کا روپ دھار گئیں۔

''تو میں فون بند کر دیتا ہوں۔''

''کر سکتے ہو تو کر دو۔'' اذعان کی بے نیازی میں بڑا مان تھا۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''کیا چاہتے ہو......؟''

''تم جانتے ہو......''

"یار ابھی ایسا کوئی سلسلہ نہیں جو تم ملوانے کی بات کر رہے ہو۔" انھوں نے زچ ہو کر کہا جب کہ نظریں گلاس وال سے اُدھر اس پر جا پڑی تھیں۔ جو اسکرین پر نظریں جمائے کی بورڈ پر دھیرے دھیرے اُنگلیاں چلا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر محسوس کی جانے والی اداسی تھی اور آنکھوں میں جانے رت جگے کی لالی تھی، یا شدتِ گریہ کی۔

"تم تو اُسے پسند کر چکے ہو نا؟" اُدھر سے اذعان پوچھ رہا تھا۔ وہ خاموش رہے شاید سنا ہی نہیں تھا۔ قدرے رُک کر اذعان کریڈل پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

"کہاں کھو گئے یار۔ چلو ملوانے کی بات سلسلہ شروع ہونے کے بعد کروں گا۔ ابھی کم از کم اُس کا حدود اربعہ تو بتا دو۔ کیسی ہے۔ کس مصور کا شاہکار ہے یا......؟"

"پتا نہیں۔ مجھے تو وہ ایسی لگ رہی ہے جیسے شام کا پہلا ستارہ......" وہ جو اُسے دیکھتے ہی اُس کے لیے تشبیہات سوچنے لگتے تھے اس وقت بے ساختہ کہہ گئے۔

"شام کا پہلا ستارہ......؟" اذعان جانے حیران ہوا، یا سمجھ نہیں پایا تھا۔

"ہاں۔ پورے آسمان پر فقط ایک ستارہ۔ کتنا تنہا کتنا اکیلا اور کتنا اداس سا لگتا ہے۔ کبھی تم نے اس منظر کو دیکھا ہے اذعان۔ میں نے دیکھا ہے بارہا۔ ابھی بھی دیکھ رہا ہوں۔ بے خودی کے عالم میں بولتے ہوئے وہ ایک دم چونکے اور فوراً رسیور رکھ کر یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ وہ کہاں ہیں۔ تب ہی وہ کوئی فائل لے کر آ گئی۔ اور بہت خاموشی سے اُن کے سامنے رکھ دی۔ تو انھوں نے بمشکل سنبھل کر اُس پر ایک نظر ڈالی اور ساتھ ہی بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ تب فائل کے صفحے اُلٹتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگے۔ "کوئی پرابلم تھی آپ کے ساتھ......؟"

"جی......" وہ سمجھی نہیں تھی۔

"آئی مین۔ آپ اتنی لیٹ آئیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" انھوں نے ذرا سا سر اُونچا کر کے اُس کی سرخی مائل آنکھوں کو دیکھا۔

"جی سر۔ بس وہ صبح اُٹھنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ آئی ایم سوری سر آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

اُس نے بتانے کے ساتھ معذرت بھی کی تو وہ فائل بند کر کے براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

"آئی ایم سوری ٹو۔" میں نے فوراً ہی آپ کو جانے کو کہہ دیا تھا۔

"نو سر۔ آپ نے تو کچھ نہیں کہا۔" وہ اُن کی نظروں کی گھمبیرتا سے گھبرا کر اپنے ناخن دیکھنے لگی تھی۔

"آپ نے فیل نہیں کیا اس کے لیے شکریہ۔" وہ اس کی گھبراہٹ سے ایک خوب صورت احساس میں گھر گئے تھے۔

"میں جاؤں سر......؟"

"نہیں۔" انھوں نے انٹر کام پر چائے کا کہا پھر اُسے دیکھ کر بولے۔ "لیٹ ہونے کے خیال سے آپ نے چائے تک نہیں پی، اس لیے اتنی ڈل ہو رہی ہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ اسی طرح اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔ چائے آنے تک وہ بھی چپ چاپ اُسے دیکھتے رہے۔ درمیان میں اتنا فاصلہ نہیں تھا پھر بھی محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اُسے چھو نہیں سکتے تھے۔ اُس کے لیے جذبوں کا اظہار اور اُس کی طرف سے اقرار ضروری تھا جو کہ فی الحال تو ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ چوکی دار چائے رکھ کر چلا گیا تو انھوں نے ٹرے اُس کے سامنے کھسکا دی، اُس نے ناخنوں سے کھیلنے کا شغل چھوڑ کر کپ سیدھے کیے اور اُن کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"چینی......؟"

"ایک چمچ۔" انھوں نے بتا کر دراز کھولا اور اس میں سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

آپ نے شاید ناشتا بھی نہیں کیا۔ پتا نہیں اُسے واقعی بھوک لگی تھی، یا محض اُن کی بات رکھنا مقصود تھا جو چائے کا کپ اُن کے سامنے رکھنے کے بعد بڑے آرام سے بسکٹ نکال کر کترنے لگی۔ ساتھ ساتھ چائے کا سپ بھی لے لیتی۔

"یہاں آفس میں تو کوئی پرابلم نہیں ہے آپ کو؟" انھوں نے خاموشی توڑنے کی غرض سے پوچھا تھا۔ اسی پل دروازہ کھلنے کے ساتھ اذعان اندر آتا ہوا بولا۔

"یار میں رہ نہیں سکا۔ بس فوراً چلا آیا۔ جلدی بتاؤ کہاں ہے وہ شام کا......"

"اذعان۔ اذعان پلیز۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چلو باہر چلو۔"

"باہر کہاں؟"

"تم چلو تو......" وہ اُسے کھینچتے ہوئے باہر لے آئے اور جھنجھلا کر بولے۔ "عجیب آدمی ہو تم میری بات تمھاری سمجھ میں نہیں آئی کہ ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"تو بھلے آدمی یہ بات تم مجھے اندر بھی کہہ سکتے تھے اور یہ تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر تو موڑ میں تھے، وہ بھی رومینٹک جیسے وہ سامنے موجود ہو۔" اذعان نے ٹوکنے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں کہا تو وہ بے اختیار بولے تھے۔

"ہاں، موجود تھی۔"

"پھر چلی گئی کیا......؟" اذعان نے فوراً پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی بھی موجود ہے۔ اگر تم اُس کے سامنے کچھ نہ کہنے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں ملوا دیتا ہوں۔"

"تو میں کیا کہوں گا۔ توبہ کرو۔ مجھے تو ایسے ہی لڑکیوں سے...... خیر چھوڑو میں وعدہ کرتا ہوں۔" اذعان نے بڑے کھلنڈرے انداز میں وعدہ کیا تو وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتے رہے پھر ساتھ آنے کا اشارہ کر کے دوبارہ اندر آئے تو وہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ شجیع الحسن اپنی جگہ بیٹھ گئے تب بھی اُسے متوجہ کرنا پڑا۔

"مس عروبہ......"

"یس سر۔" وہ چونکنے کے ساتھ غالباً اپنی بے خبری پر خائف سی ہو گئی تھی۔

"اور چائے لیں گی۔" انھیں فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چائے کا پوچھ لیا۔

"نو سر تھینک یو۔ آپ یہ فائل دیکھ لیں تو......"

"ہوں۔" وہ فائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر فوراً یوں پوز کیا جیسے اذعان کی موجودگی کا احساس ہوا ہو اور اُسے دیکھ کر بولے۔

"ارے۔ تم ابھی تک کھڑے ہو بیٹھو۔" مس عروبہ یہ اذعان ہیں میرے بہت عزیز دوست۔ اُس نے دیکھا تو اذعان مسکرا کر بولا۔

"ہیلو۔" پھر اُس کے برابر والی چیئر کھینچ کر بیٹھتے ہوئے شجیع الحسن سے مخاطب ہوا۔

"یار وہ تم نے کہا تھا شام کا......"

"مس عروبہ! پلیز آپ اپنی سیٹ پر جائیں۔" انھوں نے فوراً اُسے اُٹھا دیا اور اذعان کی کمینگی پر اندر ہی اندر تلملا کر اُسے دیکھا تو وہ یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"نان سنس۔" انھوں نے سر جھٹک کر اپنے سامنے فائل کھول لی۔ پھر اس میں مصروف ہو کر بولے تھے۔

"تم جا سکتے ہو......"

"ارے! تم تو ناراض ہو گئے یار۔ میں نے اُس سے تو کچھ نہیں کہا۔" اذعان فوراً صفائی پیش کرنے لگا۔ انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ہار کر اذعان اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں۔" پھر جاتے جاتے رُک کر بولا تھا۔

"سنو! بہت اچھی ہے۔ دیر مت کرو۔"

وہ یوں بنے رہے جیسے سنا ہی نہیں۔ لیکن پھر اذعان کے جاتے ہی اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔

وہ نادان نہیں تھی۔ شجیع الحسن کے دیکھنے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کے لیے کس انداز سے سوچنے لگے ہیں۔ پھر بھی اُس کے اندر کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ اس کے برعکس اُسے اُن سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ اُن کے اخلاق و کردار کی وہ دل سے معترف ہو چکی تھی ورنہ شاید ہمدردی بھی نہ ہوتی۔ کیوں کہ مردوں سے وہ سخت متنفر تھی اور جب

سے منیب احمد کو دیکھا اور اسماء سے حالات سننے تھے تب سے اُس کا تنفر مزید بڑھ گیا تھا۔ اور وہ شجیع الحسن کو بھی اسی قطار میں کھڑا کر کے یہ سوچنا چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی دوسرے مردوں سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ لیکن اُسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ کتنے دن وہ اپنے آپ سے اُلجھتی رہی۔ یہ اُس کے لیے دوسری ٹینشن تھی۔ ایک منیب احمد ذہن پر سوار تھے انھیں سوچنے بیٹھتی تو پتا بھی نہ چلتا کہ کب درمیان میں شجیع الحسن آ جاتے۔ اور پھر غیر ارادی طور پر وہ دونوں کا موازنہ کرنے لگتی۔ شاید اس لیے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ شجیع الحسن کا التفات بڑھتا جا رہا تھا اور اُسے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دن انجان نہیں بن سکے گی۔ یا تو اُن کے سامنے ہار جائے گی یا اس کے برعکس کوئی ایسی بات کہہ دے گی جس سے وہ شخص بہت ہرٹ ہوگا۔ اور وہ یہ دونوں باتیں نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اِن دنوں وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ اُسے یہ جاب چھوڑ دینی چاہیے۔ لیکن اُس کے بعد نئے سرے سے جاب کے لیے دھکے کھانے کے خیال سے وہ اپنی سوچ پر فوری عمل نہیں کر پا رہی تھی۔ البتہ روزانہ اخبار میں جاب ضرور دیکھنے لگی تھی۔ ایک دو بار اُسے اپنے مطلب کی جاب نظر بھی آئی لیکن وہ جا نہیں سکی تھی۔ اتفاق سے اُس دن آفس میں اتنا کام تھا کہ اُس کے ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ ورنہ اُس نے سوچا تھا کہ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر انٹرویو دے آئے گی۔ جس کا بعد میں اُسے بہت افسوس ہوا تھا۔

بہر حال اُس نے جاب دیکھنے کا سلسلہ ترک نہیں کیا تھا۔ اور اس وقت بھی شجیع الحسن کے آنے سے پہلے اخبار دیکھتے ہوئے اُسے اپنے مطلب کی جاب نظر آئی تو اُس نے فوراً وہاں سے صفحہ پھاڑ کر اپنے بیگ میں رکھ لیا اور پھر جیسے ہی شجیع الحسن آئے وہ اسی وقت اُن کے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر بولی تھی۔

''سر مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

''کہاں......؟'' انھوں نے بے ساختہ پوچھا۔ پھر فوراً معذرت کرتے ہوئے بولے۔

''سوری۔ آئی مین آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟''

''صرف دو گھنٹے کی چھٹی۔''

''آر یو شور کہ آپ دو گھنٹے میں آ جائیں گی؟''

''یس سر۔''

''او کے۔''

اُن کی اجازت ملتے ہی وہ اپنا بیگ لے کر نکل آئی اور اسٹاپ پر رُک کر بیگ میں سے اخبار کا تراشا نکال کر اچھی طرح ایڈریس سمجھا۔ پھر اس روٹ کی وین میں سوار ہوئی تو تمام راستہ متضاد سوچوں میں گھری رہی تھی۔ کبھی سوچتی واپس لوٹ جائے۔ پھر اپنی سوچ کی نفی کرنے میں لگ جاتی۔ یہاں تک کہ مطلوبہ جگہ پہنچ گئی۔ تب بھی وہ شش و پنج میں ہی تھی۔ اس سے پہلے وہاں کافی لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ بڑی بے دلی سے ایک ایک کو اندر جاتے اور باہر نکلتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جب اُس کی باری آئی تب اُسے خیال آیا کہ وہ اپنے ضروری کاغذات تو لائی نہیں اور نہ ہی سی وی تیار کی تھی۔ جلدی سے یونہی اُٹھ کر چلی آئی تھی۔

''چلیں بی بی۔'' چوکی دار دروازہ کھولے اُسے اندر جانے کا کہہ رہا تھا اور وہ منع کرنا چاہتی تھی کہ کھلے دروازے سے اندر بالکل سامنے منیب احمد پر نظر پڑی۔ ایک لحظہ کو وہ ٹھٹک گئی پھر فوراً اندر داخل ہو کر پورے اعتماد سے جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''پلیز......'' منیب احمد نے اُسے بیٹھنے کا اشارا کیا لیکن وہ یکسر نظر انداز کر گئی۔

''سی وی۔'' انھوں نے یوں ہاتھ بڑھایا جیسے وہ انھیں کاغذات تھمائے گی۔

''سوری۔ میں سی وی لانا بھول گئی لیکن مجھے سب زبانی یاد ہے۔ میرا نام عروبہ ہے۔ عروبہ منیب احمد۔'' وہ اُن کے چہرے پر نظریں جما کر بولی۔ منیب احمد کی آنکھیں ذرا سی سکڑی تھیں۔

''میں نے گریجویشن کیا ہے۔'' وہ پھر شروع ہو گئی۔ ''اس کے بعد کمپیوٹر کورس اور ابھی ایک بہت اچھی فرم میں جاب بھی کر رہی ہوں سیلری بھی بہت اچھی ہے لیکن کیوں کہ میرے گھر سے بہت دور ہے اس لیے میں اس جاب کو جاری نہیں رکھ سکتی۔''

منیب احمد جیسے غیر ارادی طور پر اُس کا بائیو ڈیٹا سننے لگے تھے اسی طرح بلا ارادہ پوچھ گئے۔

''اور یہاں سے آپ کا گھر قریب ہے۔''

''نہیں۔لیکن زیادہ دور بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ درخواست لے کر آئیں گی تو......'' منیب احمد نے ٹالنا چاہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''نہیں۔میں نہیں آؤں گی۔اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ آپ کا آفس ہے تو میں جاب کے لیے کبھی نہ آتی البتہ......'' دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ بات ادھوری چھوڑ کر آنے والے کو دیکھنے لگی۔ جو ایک سرسری نظر اس پر ڈال کر منیب احمد کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''پاپا! میں نے یہ پیپرز تیار کر دیئے ہیں آپ سائن کر کے بھجوا دیجیے گا۔'' منیب احمد نے خرم کے ہاتھ سے فائل لے کر ٹیبل پر رکھی پھر اُسے دیکھ کر بولے۔

''او کے بی بی آپ جا سکتی ہیں۔''

''جانے سے پہلے میں اپنی ایک غلطی کی تصحیح کر دوں سر کہ میرا نام عروبہ منیب احمد نہیں بلکہ عروبہ بنت اسماء ہے۔اور یہ بھی بتا دوں کہ ہم ماں بیٹی نے منیب احمد کے بغیر بہت اچھی زندگی گزاری ہے اور گزار رہے ہیں۔خدا حافظ۔'' وہ اپنی پہچان کروا کے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ منیب احمد نے پکار لیا۔

''سنو لڑکی......''

وہ سن کر بھی نہیں رُکی اور آفس سے نکل کر اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی تھی۔اسی رفتار سے اُس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔جانے کیوں اتنے اعتماد کا مظاہرہ کر کے اب خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔بالکل نروس بچی کی طرح جو اپنے پیچھے کسی مشکوک شخص کو دیکھ کر پکڑے جانے کے خوف سے بھاگنے لگتی ہے۔

اسٹاپ تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا پھر بھی تیز چلنے کے باوجود اُسے لگا جیسے وہ وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی۔اس سے پہلے ہی ڈھے جائے گی۔شاید اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔بڑی مشکل سے اسٹاپ تک پہنچی لیکن پھر بس کا انتظار کرنے کی بجائے رکشہ میں بیٹھ گئی تھی۔

''یا اللہ! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' رکشہ کے شور میں بھی اُسے اپنی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔دل پر ہاتھ رکھ کر وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔آفس پہنچنے تک وہ نارمل ہونا چاہتی تھی۔اور کسی حد تک ہو بھی گئی تھی اور چاہتی تھی کہ فوراً اپنے کام میں مصروف ہو کر دھیان بٹائے لیکن شجیع الحسن بھی جیسے اُس کے منتظر تھے۔فوراً اُسے اپنے کمرے میں بلا لیا جس سے وہ یہی سمجھی کہ اُسے آنے میں دیر ہو گئی ہے تب ہی اُن کے سامنے جاتے ہی بولی تھی۔

''سوری سر میں کچھ لیٹ ہو گئی۔''

''بیٹھ جائیں۔'' وہ اُس کی بات اَن سنی کر کے بولے۔وہ اندر ہی اندر پریشان ہوتی بیٹھ گئی۔

''آپ اپنی اس جاب سے مطمئن نہیں ہیں؟'' شجیع الحسن نے اُس کے بیٹھتے ہی پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

''نو سر ایسا تو نہیں ہے۔آئی مین یہ آپ سے کس نے کہا۔'' وہ کچھ دیر اُس پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔پھر اسی خاموشی سے اخبار پھیلا کر وہ صفحہ اُس کے سامنے کر دیا جہاں سے اُس نے جاب کا تراشا پھاڑا تھا۔جسے دیکھ کر اُس نے بھی خاموشی سے سر جھکا دیا۔

''کیسا رہا آپ کا انٹرویو۔'' قدرے توقف سے انھوں نے بظاہر سیدھے سادے انداز میں پوچھا اور وہ جو پہلے ہی پریشان تھی اس نئی صورت حال سے اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں۔اور روکتے روکتے بھی قطرہ قطرہ پلکوں سے ٹپکنے لگا تھا۔شجیع الحسن نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھ دی پھر جیب سے رومال نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''پلیز......'' اُس نے رومال لینے کی بجائے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔پھر انھیں دیکھ کر بولی تھی۔

''معاف کیجیے گا سر میں یہاں جاب کروں یا کہیں اور یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔''

''مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن کیا آپ بھول گئیں کہ یہاں سے آپ یوں اچانک جاب چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔کم از کم ایک مہینہ پہلے آپ کو بتانا پڑے گا۔'' انھوں نے اپنی فرم کا

حصّہ دوم

اُصول یاد دلایا جس سے اُسے اپائمنٹ لیٹر میں ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔

''مجھے یاد ہے اور یہ بھی کہ دوسری صورت میں مجھے ایک مہینے کی تنخواہ سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔نو پرابلم میں جاب کے ساتھ اس مہینے کی سیلری بھی چھوڑ رہی ہوں۔ وہ اچانک فیصلہ کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھ جائیں پلیز۔'' شجیع الحسن کے لہجے میں تحکم سمٹ آیا تھا۔ وہ جس طرح کھڑی ہوئی تھی اُسی طرح بیٹھ گئی۔

''کیا پرابلم ہے آپ کے ساتھ......؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہاں سے کیوں جانا چاہتی ہیں۔ ماحول اچھا نہیں۔ سیلری کم ہے، یا......''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ عاجزی سے بولی تھی۔

''پھر کیوں جانا چاہتی ہیں۔ کیا دوسرے لوگ زیادہ کی آفر کر رہے ہیں......؟''

''نو سر۔ مجھے جاب کرنی ہی نہیں ہے۔''

''پھر کیا کریں گی۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھے جو ہر صورت اُسے روکنا چاہتا تھا۔''

''ابھی سوچا نہیں۔''

''چلیں۔'' جب تک سوچ نہیں لیتیں تب تک آپ یہیں کام کریں گی۔ جائیں اپنی سیٹ پر۔ انھوں نے تحکم سے کہا تو وہ خاصے روٹھے انداز میں اُٹھی تھی۔

عروبہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ ایک منیب احمد نے سامنا کیا کم تھا جو مزید شجیع الحسن۔ آخر انھیں کیسے پتا چلا کہ میں کہیں اور انٹرویو دینے گئی تھی۔ اخبار میں سے تراشا کوئی اور بھی تو پھاڑ سکتا تھا۔ انھیں صرف میرا ہی خیال کیوں آیا، اور وہ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے۔ میری مرضی میں کہیں بھی جاب کروں۔ وہ منتشر ذہن کے ساتھ جانے کیا کچھ سوچے جا رہی تھی۔ شاید منیب احمد کے خلاف دل میں جو عداوت اور بغاوت تھی وہ بھی ادھر منتقل ہو رہی تھی۔ کتنی دیر کڑھنے کے بعد بھی کام کرنے پر اُس کا دل آمادہ نہیں ہوا تو جو ڈسک مسلسل اُنگلیوں میں گھما رہی تھی اُسے ٹیبل پر پٹخ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے گلاس وال سے شجیع الحسن کو دیکھا پھر اُن کے کمرے میں چلی آئی۔

''ایکسکیوز می سر۔'' انھوں نے اپنے سامنے پھیلے نقشے سے نظریں اُٹھا کر اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بے سوچے سمجھے کہہ گئی۔

''سر! مجھے چھٹی چاہیے۔''

''اب کہاں جانا ہے؟'' سیدھا سادا سوال اور ایسا ہی انداز تھا۔ پھر بھی وہ جز بز سی ہوگئی۔

"گھر......"

"کیوں؟" وہ خاموش رہی تو کچھ دیر بغور اُس کا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ بولے تھے۔

"او کے۔ اینڈ آئی ہوپ کہ کل جب میں آؤں گا تو آپ بہت فریش موڈ کے ساتھ مجھے اپنی سیٹ پر نظر آئیں گی۔"

"ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نظر ہی نہ آؤں۔" اُس نے سوچا۔ پھر جلدی سے اُن کا شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے سے بیگ لیتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

منیب احمد نے تو اُسے پکارا تھا جب کہ خرم اُس کے پیچھے بھاگتا آیا تھا۔ گو کہ وہ ساری صورت حال سمجھ نہیں پایا تھا۔ نہ یہ کہ وہ لڑکی کون ہے۔ اُس نے تو بس اُس لڑکی کے منہ سے اپنی ممی کا نام سنا تھا اور یہ کہ وہ اُن کے ساتھ اپنا کوئی تعلق ظاہر کر رہی تھی۔ اور پھر جس تیزی سے وہ لڑکی نکلی تھی اُسی تیزی سے اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ اُس کے ذریعے اپنی ممی تک پہنچ سکتا ہے۔ اور اس اچانک خیال کے تحت ہی وہ اُس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اور جب تک گاڑی اسٹارٹ کر کے اُس تک پہنچا وہ رکشہ میں بیٹھ چکی تھی۔

خرم نے اپنی گاڑی اس رکشہ کے پیچھے لگا دی تھی پھر جس بلڈنگ میں وہ داخل ہوئی اُس کی پارکنگ میں رُک کر وہ اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کیوں کہ اُس کے خیال میں وہ یہاں بھی جاب کے سلسلے میں انٹرویو دینے آئی ہوگی۔ اور یقیناً ایک آدھ گھنٹے میں واپس آئے گی تو وہ یا تو اُسے یہیں روک کر تفصیل سے اُس کے بارے میں پوچھے گا یا پھر اُس کے پیچھے اُس کے گھر تک جائے گا۔ کیوں کہ یہ سنہری موقع وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا، اور اس کی قسمت اچھی تھی جو اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

"ایکسکیوز می مس۔" وہ اُسے دیکھتے ہی گاڑی اُس کے قریب لے آیا تھا۔ عروبہ نے رُک کر اُسے دیکھا پھر پیشانی پر شکنیں ڈال کر بولی تھی۔

"فرمائیے۔"

"مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اگر آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں تو میں آپ کو گھر بھی چھوڑ دوں گا اور......"

"شکل سے کیا میں اتنی ہی بے وقوف لگتی ہوں۔" وہ اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے تنک کر بولی تھی۔

"او نو۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ چلیں آپ گاڑی میں نہ بیٹھیں یہیں کھڑے کھڑے میرے چند سوالوں کا جواب دے دیں۔" وہ کہتا ہوا فوراً دروازہ کھول کر نیچے اُترا اور اُس کے مقابل کھڑا ہو گیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر اپنے آپ سے بولی تھی۔

"ایک نئی مصیبت۔ آج دن کا آغاز ہی اچھا نہیں ہوا۔"

"مجھ سے کچھ کہا۔" خرم نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ تڑخ کر بولی۔

"جی نہیں۔ آپ سے کہنے سننے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں سے اپنے راستے پر چل پڑی تھی۔

ارے...... اُس کے پیچھے دیکھتے ہوئے خرم کو اچانک ہوش آیا تو فوراً گاڑی میں بیٹھ کر اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ اسٹاپ پر کافی لوگ تھے۔ اس لیے وہاں اُسے پکارنے کا خیال چھوڑ کر وہ اس بار اُس کی بس کا تعاقب کرنے لگا تھا اور بہت زیادہ ہوشیار رہنے کے باوجود اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ درمیان میں کہیں وہ اُتر کر دوسری بس میں نکل گئی تھی۔ اور وہ اُس بس کے آخری اسٹاپ تک جا کر بہت مایوس لوٹا تھا۔

"ک۔ کیا ہوا۔ کہاں ہے وہ لڑکی؟" منیب احمد بڑی شدت سے اُس کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی اتنی بے قراری سے پوچھا کہ وہ کچھ ٹھٹک گیا۔

"کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں؟"

"جس کے پیچھے تم بھاگے تھے۔" منیب احمد کا انداز ایسا تھا جیسے ایک پل میں اُس سے سب اُگلوا لینا چاہتے ہوں۔ حقیقتاً اُن سے صبر نہیں ہو رہا تھا اور وہ اتنا ہی اُن کا صبر آزما رہا تھا۔

"کون تھی وہ......؟"

"تمھاری بہن۔ سنا تمھاری بہن تھی۔ اب بتاؤ کہاں ہے وہ......؟" منیب احمد نے زچ ہو کر کہا تو وہ یوں کھڑا رہا جیسے اُن کی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ آنکھوں میں غیر یقینی سی تھی۔

"کیا کہا پاپا آپ نے۔ میری بہن......"

"ہاں تمھاری بہن۔ کہاں چھوڑ آئے اُسے......؟"

میں نے تو کہیں نہیں چھوڑا اُسے۔ وہی چھوڑ گئی۔ پتا نہیں پاپا کہاں چلی گئی۔ میں تو آخر تک اُس کے پیچھے گیا تھا۔" وہ تھکے تھکے انداز میں ڈھے گیا تھا۔

"کہاں، کہاں گئے تھے؟" اُس کے برابر بیٹھ کر منیب احمد نے اُس کے کندھے تھام کر اپنی طرف موڑا۔

وہ بس میں سوار ہوئی تھی اُس کے پیچھے آخر تک۔ لیکن شاید وہ راستے میں ہی کہیں اُتر گئی۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا، حالانکہ میں......" وہ جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا۔

"او گاڈ۔" منیب احمد کی حالت منزل کے قریب پہنچ کر بھٹکنے والے مسافر جیسی ہو گئی تھی۔ پھر کتنی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں محو تھے اور یقیناً دونوں کی سوچوں کا محور ایک ہی تھا۔

"پاپا۔" خرم نے اچانک خیال آنے پر انھیں پکار کر پوچھا۔ "یہ بہن کہاں سے آ گئی۔ آئی مین آپ نے پہلے تو اُس کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"ہوں......" منیب احمد ابھی بھی سوچ میں ڈوبے تھے۔ پھر چونک کر اُسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں اُس کے وجود سے لاعلم تو نہیں تھا لیکن کیوں کہ اُسے دیکھا نہیں تھا اس لیے کبھی اُس کا خیال بھی نہیں آیا۔ شروع میں سوچتا تھا کہ پتا نہیں اسماء کے پاس تمھارا بھائی ہے یا بہن۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میرے ذہن سے بہت ساری باتیں محو ہوتی گئیں اور آخر میں صرف ایک تمھاری ممی یاد رہیں۔ باقی سب تو بعد میں آتے ہیں نا۔"

"اب بتائیں ہم انھیں کہاں تلاش کریں۔ اسی شہر میں جانے کہاں ہیں وہ۔" مایوسی سے

بولتے ہوئے خرم کو اچانک اُمید کی کرن نظر آئی تھی۔

"پاپا وہ دوبارہ وہاں ضرور آئے گی۔ میں کل پھر جاؤں گا۔"

"کہاں......؟"

"وہیں جہاں وہ جاب کے لیے آئی تھی۔ مجھے یہی لگتا ہے جیسے وہ یہاں جاب کے لیے آئی تھی وہاں بھی اسی سلسلے میں گئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہاں اُسے جاب مل گئی ہو۔ پھر تو وہ وہیں ملے گی۔ میں کل صبح ہی جاؤں گا۔" خرم مایوسی سے نکل کر خاصا پُرجوش ہو گیا تھا۔

"بس آج کا دن ہے پھر میں ممی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"ہوں۔" منیب احمد اسی سوچتے انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگے تھے۔

وہ کتنے ہی ضروری کام چھوڑ کر آفس سے جلدی نکل آئے تھے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی کوئی کام اُدھورا نہیں چھوڑا تھا۔ اور نہ ہی انھیں آج کا کام کل پر ٹالنے کی عادت تھی۔ بلکہ اس بات کو تو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ حرکت قرار دیتے اور آج خود اس حرکت کے مرتکب ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے دل سے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ لڑکی عروبہ منیب احمد اُن کے لیے اتنی اہم ہو گئی ہے کہ اُس کے لیے وہ اپنے مرتب کردہ اُصولوں سے نظریں چرا سکتے ہیں۔ گویا اُن کی زندگی میں وہ موڑ آ گیا تھا کہ اپنی ذات سے نظریں چراتے چراتے اب اچانک اپنا احساس ہونے لگا تھا۔ اور وہ تمام راستہ بڑی سنجیدگی سے اُس کے بارے میں سوچتے آئے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو غیر معمولی چہل پہل کا احساس ہوا تھا۔

"کون آیا ہے؟" انھوں نے گاڑی کی چابی ڈرائیور کو تھماتے ہوئے پوچھا تب ہی نتاشہ اور ثانیہ کے بچے بھاگتے ہوئے آ کر اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

"ماموں جانی، آئس کریم۔"

"ملے گی ضرور ملے گی۔ پہلے اندر چلو تمھاری ماؤں سے مل لوں۔ وہ ثانیہ کے تین سالہ بیٹے کو گود میں اُٹھا کر بولے۔" پھر چاروں بچوں کے ساتھ اندر آئے تو تینوں بہنیں سر جوڑے

جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔

''یقیناً میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔'' انھوں نے تینوں کے سر پر پہنچ کر زور سے کہا تو وہ اُچھل پڑیں۔

''ہائے بھائی آپ کب آئے؟''

''ابھی آ رہا ہوں خیریت......؟'' انھوں نے باری باری تینوں کو دیکھا۔

''بالکل خیریت۔ بس آپ جلدی سے فریش ہو کر آجائیں۔ لائیے اُسے مجھے دیں۔'' روبی نے اُن کی گود سے بچہ لیتے ہوئے کہا تو وہ پھر بے ساختہ بولے تھے۔

''خیریت۔''

''یا اللہ۔ تینوں ہٹی کٹی آپ کے سامنے کھڑی ہیں پھر بھی خیریت پوچھے جا رہے ہیں۔'' نتاشہ کھلکھلا کر بولی تھی۔

''میں تمھاری نہیں اپنی خیریت پوچھ رہا ہوں۔ کیا سازش ہوئی ہے ابھی میرے خلاف۔'' انھیں تینوں کی ایک ساتھ آمد پر کچھ شبہ ہوا تھا۔ اور یہ تم تینوں کے سرتاج کہاں ہیں۔

''آنے والے ہیں وہ بھی۔'' نتاشہ نے فوراً کہا۔

''اپنی خیر۔'' وہ مزید مشکوک ہوئے۔

''آپ دیر نہیں کریں بھائی۔ اُن کے آنے سے پہلے تیار ہو جائیں۔'' ثانیہ نے زبردستی انھیں اُن کے کمرے کی سمت موڑ کر دھکیلنا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔

''آخر پتا تو چلے کس سلسلے میں۔''

''بھائی پلیز ہم آپ کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔'' روبی نے منت سے کہا تو وہ مزید جرح ترک کر کے اپنے کمرے میں آگئے۔ شاور تو خیر وہ آفس سے آنے کے بعد لیتے ہی تھے لیکن باقاعدہ تیار ہونا مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن بہنوں کی خوشی کا خیال کر کے وہ اس مشکل مرحلے سے گزر آئے۔ گرے کلر تھری پیس سوٹ میں جب وہ دوبارہ نیچے آئے تو کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اُن کے تینوں بہنوئی بھی آچکے تھے۔ اور سب ٹیبل کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ انھیں

ٹیبل پر بڑا سا کیک دیکھتے ہی یاد آگیا کہ آج اُن کی برتھ ڈے ہے۔ جسے اُن کی بہنیں ہمیشہ اسی اہتمام سے منایا کرتی ہیں۔ اور ہمیشہ اس دن وہ سوچتے تھے کہ آئندہ وہ اس تاریخ کو یاد رکھیں گے اور بہنوں سے لینے کی بجائے وہ انھیں گفٹ دیا کریں گے۔ لیکن پھر بھول جاتے تھے۔

''یہ سازش تھی۔'' روبی نے اُن کے ہاتھ میں چھری تھماتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ باز نہیں آؤ گے۔'' انھوں نے کیک کاٹ کر چھری وہیں رکھ دی۔ اور ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کے شور میں مسکراتے ہوئے بہنوئیوں کو لے کر بیٹھ گئے کہ اب باقی کام بہنوں کا تھا۔ تھوڑے ہلے گلے کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اُس کے بعد جب چائے کا دور چلا تو اس دوران نتاشہ نے اُن کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اب اُن کے پاس اس ذکر سے بچنے کا کوئی بہانہ کوئی جواز نہیں رہا تھا تو ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ پسند کرنے کا اوّلین مرحلہ وہ طے کر چکے تھے۔ لیکن سب کے سامنے اعتراف کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ جب تک کہ وہ اُس کی مرضی نہ معلوم کر لیں۔

''دھیرج، دھیرج۔'' بہنوں کے بہت شور مچانے پر انھوں نے سب کو خاموش کرایا پھر مسکرا کر بولے تھے۔

''میں بہت جلدی تمھاری یہ خواہش پوری کروں گا۔''

''سچ بھائی۔'' خوشی سے روبی کے حلق سے چیخ نما آواز نکلی تھی۔ اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ جب کہ نظروں میں اُس روٹھی لڑکی کا سراپا آن سمایا تھا جس کی آنکھوں سے گرتے قطرہ قطرہ موتی وہ شدید خواہش کے باوجود اپنی اُنگلیوں پر نہیں سمیٹ سکے تھے۔

''اُس کے ساتھ ضرور کوئی پرابلم ہے۔'' جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو پھر اُسی کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔

''اُس کی آنکھوں میں کسی محرومی کا احساس کروٹیں لیتا ہے۔''

''اُس کی مسکراہٹ میں ایک دُکھ پنہاں ہے جو محسوس ہوتا ہے۔''

''کبھی کبھی وہ بے حد تنہا لگتی ہے۔''

"اپنی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج۔"

"جانے اُس کے دل میں کیا ہے۔ مجھے اب دیر نہیں کرنی چاہیے کہیں دیر نہ ہو جائے۔"

وہ ایک فیصلہ کرنے کے بعد سوئے تھے۔

صبح وہ معمول کے مطابق اخبار لے کر لان میں آبیٹھے تھے۔ بہار کی آمد بھی اس وقت ہوئی تھی۔ جب اندر کا موسم بھی ایسا ہی حسین تھا۔ خوشبوئیں بکھیرتی نرم ہوا کی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر خوب صورت فضا میں کھوئے رہے۔ کبھی پھولوں کی سرمستیاں دیکھتے، کبھی مخملیں گھاس پر شبنم کے موتی، کبھی دور تک پھیلے آسمان کی نیلاہٹوں میں کھو جاتے۔ دینو بابا چائے لے کر آئے تو ساتھ کارڈلیس بھی انھیں تھما دیا۔

"اذعان میاں کا فون ہے۔"

"اتنی صبح۔" انھوں نے کارڈلیس کان سے لگا کر کہا۔ "صبح بخیر۔"

"چھوڑ دیار۔ اپنی تو نہ صبح بخیر ہوتی ہے نہ شب بخیر۔" اذعان نے اُن کے صبح بخیر کہنے پر اُکتا کر کہا۔

"خیریت۔" انھوں نے چائے کا سپ لے کر پوچھا۔

"ماما کو میری خیریت مطلوب نہیں ہے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئی ہیں۔" اذعان کے رُوٹھے انداز پر وہ اُس کا مسئلہ سمجھ گئے تھے۔

"تو اُن کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ میری جان پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ تم ایسا کرو سب کچھ ماما پر چھوڑ دو۔ مجھے یقین ہے وہ تمھارے لیے جس لڑکی کا انتخاب کریں گی وہ صرف تمھاری ہوگی۔"

"صرف میری ہونے کا دعویٰ کرے گی ہو گی نہیں۔" اذعان چڑ کر بولا تھا۔

"کم آن یار۔ اتنی خوب صورت صبح کے آغاز پر اپنے فضول خیالات سے میرا موڈ خراب مت کرو۔" انھوں نے قدرے ناگواری سے ٹوکا تو اُدھر سے اذعان زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔

"سوری یار۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آج کل تم پر بُرا وقت آیا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا۔"

"تم جانتے ہو اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔ صاف صاف بتانا ورنہ میں پھر پہنچ جاؤں گا تمھارے آفس۔" اذعان کی دھمکی پر وہ اندر ہی اندر تلملا گئے لیکن بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوئے۔

"بس یار ابھی تک تو معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ اصل میں میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس سے کیا کہوں۔"

"نرے گاؤدی ہو یار۔ ایک لڑکی نہیں پٹا سکتے۔"

"مجھے معلوم ہے تم اس کام میں بڑے ایکسپرٹ ہو۔" انھوں نے جل کر کہا۔

"ہاہاہاہا......" اذعان کے قہقہے نے مزید جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ انھوں نے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

"افسوس میری صحبت میں رہ کر بھی تم کچھ نہیں سیکھ سکے۔" اذعان اُن کا مذاق اُڑا رہا تھا۔

"یہ اللہ کا بڑا کرم ہے، مجھ پر کہ اُس نے مجھے تمھارے رنگ میں نہیں رنگنے دیا۔ او کے خدا حافظ......" وہ سلسلہ منقطع کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ رات بہت سوچنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اُسے امی کو منیب احمد کے بارے میں بتانا چاہیے یا نہیں۔ کیوں کہ یہ کوئی عام سی بات نہیں تھی جسے سن کر وہ اہمیت نہ دیتیں۔ اُس روز اُس کے سامنے اپنی کتاب زندگی کے اوراق اُلٹتے ہوئے خرم کے لیے اسماء کی مامتا کتنی بے قرار ہوئی تھی یہ اُس نے بھی دیکھا تھا اور بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس لیے اب وہ شش و پنج میں تھی کہ اگر منیب احمد کا سن کر اُس نے خرم کو دیکھنے اور اُس سے ملنے پر اصرار کیا تو وہ اُسے روک بھی نہیں سکے گی۔ جب کہ خود اُس کے دل میں باپ بھائی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بلکہ حد درجہ تنفر تھا اور اسی تنفر میں وہ منیب احمد پر جتا بھی آئی تھی کہ اُن کے بغیر اُس کی زندگی بہت اچھی گزری ہے اور گزر رہی ہے۔ اور حقیقتاً وہ نہیں چاہتی تھی کہ منیب احمد، یا خرم آ کر

اُس کی ماں کے پرانے زخموں کو چھیڑیں جن پر وقت نے مرہم رکھ کر کافی حد تک بھر دیا تھا۔

"تم کچھ پریشان ہو بیٹا۔ کیا پریشانی ہے؟" اسماء کل سے نوٹ کر رہی تھی۔ ابھی بھی ناشتا کرتے ہوئے اُسے گہری سوچ میں دیکھ کر آخر کار ٹوک دیا۔

"مجھ سے چھپا رہی ہو۔" اسماء مسکرائی تھی۔

"آپ سے کیوں چھپاؤں گی۔ پہلے کبھی کوئی بات چھپائی ہے۔ آپ کو تو بس یونہی وہم ہو جاتے ہیں۔" وہ خواہ مخواہ چڑ گئی اور ناشتا چھوڑ کر اُٹھنے لگی تھی کہ اسماء نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ناشتا تو کرلو۔"

"بس کرلیا۔ اور یہ نانا ابا صبح صبح کہاں چلے گئے۔" اُس نے اپنی طرف سے دھیان ہٹانے کی خاطر نانا ابا کا پوچھا۔

"پنشن کے لیے گئے ہیں۔" اسماء نے بتایا تو وہ گہری سانس کے درمیان کہنے لگی۔

"پنشن۔ نانا ابا سے کہیں وہ رضا کارانہ طور پر اس سے دست بردار ہو کر سکون سے ہو جائیں۔ خواہ مخواہ دھکے کھاتے ہیں۔"

"تم آج آفس نہیں جاؤ گی؟" اسماء نے اُس کی بات اَن سنی کر کے پوچھا۔

"موڈ نہیں بن رہا لیکن گھر بیٹھ کر بھی کیا کروں گی۔ کیوں میاں مٹھو کیا کرنا چاہیے۔" وہ بولتے ہوئے طوطے کے پنجرے کے پاس آگئی تھی۔

"روبا، روبا۔" توجہ ملتے ہی طوطے نے خوشی کا اظہار کیا۔

"روبا کے بچے میں کیا پوچھ رہی ہوں۔" اُس نے پنجرے کی سلاخوں سے اُنگلی اور انگوٹھا اندر کر کے طوطے کی چونچ پکڑی۔

"آفس جاؤں یا نہ جاؤں؟"

اسماء نے ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے اُسے دیکھا پھر کچن میں چلی گئی۔

"سنو دعا کرو مجھے کہیں اور اچھی جاب مل جائے۔" وہ اب دھیمی آواز میں طوطے سے راز و نیاز کرنے لگی تھی۔ "یہ جاب اچھی تو ہے لیکن وہ جو سر ہیں نا، سر شجیع الحسن اُن سے مجھے ڈر لگنے لگا

ہے۔ نہیں خوف ناک تو نہیں ہیں۔ اُن کے ارادے خطرناک لگ رہے ہیں اور میرے ارادے تو تم جانتے ہو اُن سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جو میں اُن پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے دوسری جاب تلاش کر رہی ہوں۔ دُعا کرو یہ مہینہ خیریت سے گزر جائے۔ سن رہے ہو کہ نہیں۔"

"سب سن رہا ہے لیکن بے چارہ بول نہیں سکتا۔" اسماء نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا پھر یوں سر جھٹکا جیسے وہ بے وقوف ہے۔

"کیوں نہیں بولتا تو ہے۔" وہ اپنے آپ کہتے ہوئے اندر آگئی اور کپڑے نکال کر استری کرنے لگی۔ گو کہ نو بج چکے تھے پھر بھی اُس نے استری سے لے کر تیاری تک ہر کام بڑے آرام سے کیا اور دس بجے گھر سے نکلی تھی۔

گیارہ بجنے میں دس منٹ تھے جب وہ آفس پہنچی تو پہلے مرحلے پر اشفاق صاحب سے سامنا ہو گیا وہ اُسے دیکھتے ہی بولے۔

"مس منیب! بہت لیٹ ہوگئیں آپ۔ سر کتنی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں اور اب تو بہت غصے میں ہیں۔"

"اچھا پھر تو مجھے فوراً نوکری سے نکال دیں گے۔" وہ جو اس خیال سے قصداً لیٹ ہوئی تھی بے ساختہ کہہ بھی گئی۔

"ہو سکتا ہے۔" اشفاق صاحب نے اپنے تئیں اُسے مایوس کیا تھا اور وہ اندر ہی اندر خوش ہوگئی لیکن اُن کے سامنے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ کر انتظار کرنے لگی کہ کب شجیع الحسن اُسے بلا کر نکل جانے کو کہتے ہیں۔ اور وہ تھے کہ فون پر جانے کون سے معاملات طے کر رہے تھے۔ شاید کسی پروجیکٹ پر بات ہو رہی تھی۔ کیوں کہ اُن کی نظریں اپنے سامنے پھیلے نقشے پر تھیں۔ اور اُنگلیوں میں دبی پنسل بھی اُسی پر اِدھر اُدھر حرکت کر رہی تھی۔ تھوڑے انتظار کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ جو میٹرز فیکس کرنے تھے پہلے انھیں الگ کیا پھر جب کمپیوٹر کا کھیل شروع ہوا تو وقتی طور پر اُس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی۔ اور وہ پورے دھیان سے اسکرین پر نظریں جمائے کی بورڈ پر اُنگلیاں چلانے لگی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد انٹرکام کی بزر سے اُس نے ایک لحظہ کو اسکرین سے نظریں ہٹائیں تھیں پھر اسی مصروف انداز میں ریسور اُٹھایا تھا۔

''پلیز، کم ہیر......'' شجیع الحسن نے اِسی قدر کہا تھا کہ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی تھی۔

''اسلام علیکم سر۔''

''وعلیکم سلام۔'' شجیع الحسن نے جواب دے کر ایک لحظہ توقف کیا پھر اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کر کے بولے۔''آپ کے فادر آئے ہیں۔''

''جی......'' اُس نے نا سمجھنے والے انداز میں اُن کے سامنے بیٹھے شخص کی پشت کو دیکھا تھا کہ اُسی پل منیب احمد کھڑے ہو کر اُس کی طرف گھوم گئے تھے۔

''آپ......'' اُس کے ہونٹ آپ کہنے کے لیے نیم وا ہو کر رہ گئے اور آنکھوں میں ناگواریت کے ساتھ کچھ خوف سا سمٹ آیا تھا۔

''یہ آپ کے فادر ہیں۔'' شجیع الحسن جو بغور اُسے دیکھ رہے تھے اُس کے خوف زدہ ہونے پر جانے کیا سمجھے جو تصدیق کی خاطر پوچھا تو وہ بے بسی کی انتہاؤں پر پہنچ گئی تھی کہ نا کہنا مشکل تھا تو ہاں کہنا مشکل ترین۔

''چلو بیٹا۔ میں نے آپ کے باس سے اجازت لے لی ہے۔'' منیب احمد نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو اُس کا دل چاہا انھیں دھکیل کر بھاگتی ہوئی باہر نکل جائے لیکن اُس کے بازوؤں میں سکت تھی نہ ٹانگوں میں جان اور یوں لگ رہا تھا جیسے کندھے پر رکھے ہاتھ نے اچانک اُسے سہارا دیا ہو۔

''میں جاؤں سر......'' اُسے تماشا نہیں بننا تھا اس لیے ساری توانائیاں صرف کر کے شجیع الحسن کی طرف دیکھا تو اُن کی کھوجتی ہوئی قدرے مشکوک نظروں سے بے حد توہین کا احساس ہوا۔ فوراً سنبھل کر بولی۔

''سر یہ میرے فادر ہیں۔ برسوں بعد پاکستان آئے ہیں۔'' شجیع الحسن نے یونہی اثبات

میں سر ہلا دیا تھا۔

''او کے۔ تھینک یو......'' منیب احمد نے پلٹ کر شجیع الحسن سے ہاتھ ملایا پھر اُس کی طرف دیکھا تو وہ اُن سے پہلے نکل آئی تھی۔

خرم گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گاڑی کے دونوں دروازے کھول دیئے۔

''آپ......'' اُس نے خرم کی طرف یوں اشارا کیا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم کل تو آئے تھے۔

''ہاں۔ کل میں تمھیں یہی بتانا چاہتا تھا کہ میں تمھارا بھائی ہوں۔'' خرم نے اُس کا اشارا سمجھ کر فوراً کہا۔

''کوئی بھائی نہیں ہے میرا۔ اور آپ۔ آپ کو بھی میں نہیں جانتی۔ چلے جائیں آپ لوگ یہاں سے۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' اُس کا تنفر اچانک عود کر آیا تھا۔

''بیٹا! راستے میں چلانا اچھی بات نہیں ہے۔ چلو بیٹھو۔'' منیب احمد نے دھیرج سے کہتے ہوئے خرم کو اشارہ کیا تو اُس نے آگے بڑھ کر اُسے کندھوں سے تھام کر زبردستی گاڑی میں بٹھایا۔ پھر منیب احمد کے بیٹھتے ہی فوراً اسٹیرنگ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اتنا آناً فاناً یہ سب ہوا کہ وہ سنبھل ہی نہیں سکی تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہی خرم نے اُس سے پوچھا۔ وہ یک دم بھپر گئی۔

''ہرگز نہیں۔ میں کبھی آپ کو گھر کا راستہ نہیں بتاؤں گی۔ آپ ساری زندگی ڈھونڈتے رہیں گے امی کو۔ وہ نہیں ملیں گی۔''

''او کے بیٹا۔ او کے۔ آپ ناراض نہ ہوں۔'' منیب احمد نے دھیرج سے اُسے رام کرنے کی کوشش کی پھر خرم سے بولے۔''خرم اپنے گھر چلو بیٹا۔''

''نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہیں اُتار دیں۔'' وہ پھر چیخی۔ ''گاڑی روکیں ورنہ میں......''

''ڈونٹ بی سلی۔'' منیب احمد کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

''پاپا پلیز......'' خرم کو اُن کا ڈانٹنا اچھا نہیں لگا۔'' پھر اُس سے مخاطب ہوا۔ ''سوری سسٹر۔ اصل میں تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ ہم تمھاری اور ممی کی تلاش میں کتنے عرصے سے پریشان پھر رہے ہیں۔ تم ایک بار مجھے ممی سے ملا دو پھر اگر وہ کہیں گی تو میں اور پاپا دوبارہ کبھی تمھاری طرف نہیں آئیں گے۔''

''ہونہہ......'' وہ نخوت سے سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی جانے کن راستوں پر دوڑ رہی تھی۔ اُسے لگا جیسے وہ اسماء سے بہت دُور ہوتی جا رہی ہے۔

''اُف۔ امی تو اکیلی ہو جائیں گی۔'' اُس نے دُکھ سے سوچا اور ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''اوہو بیٹا......'' منیب احمد نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''روتے نہیں ہیں۔ ہم گھر ہی تو جا رہے ہیں۔''

''میں امی کی پاس جاؤں گی۔'' وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

''وہیں چلتے ہیں۔ خرم گاڑی موڑو بیٹا۔ دیکھو بہن کیا کہہ رہی ہے۔'' منیب احمد نے اُسے تسلی دینے کے ساتھ خرم کو مخاطب کر کے کہا۔ تو اُس کے پوچھنے سے پہلے وہ بول پڑی۔ ''دھمن آباد......'' منیب احمد کے چہرے پر اطمینان اُتر آیا اور خرم نے راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی موڑتے ہی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ پھر بقیہ راستہ وہ اشاروں سے بتاتی رہی تھی اور جیسے ہی گھر کے سامنے گاڑی رُکی وہ فوراً اُتر کر بھاگتی ہوئی اندر آئی تو سامنے نانا ابا نظر آئے وہ اُن ہی سے لپٹ گئی۔

''نانا ابا انھیں اندر نہیں آنے دیجیے گا۔ دروازہ بند کر دیں نانا ابا۔ دروازہ بند کر دیں۔''

''بیٹا۔ بیٹا کون ہے۔'' نانا ابا پریشان ہو گئے۔

''بس آپ دروازہ بند کر دیں۔''

''کیا بات ہے۔'' اسماء کچن سے نکلی تھی اُسے نانا ابا کے ساتھ لپٹ کر روتے دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''رویا، کیا ہوا بیٹی۔''

''آپ نہیں جائیں گی۔ میں بھی نہیں جاؤں گی۔'' وہ کہتے ہوئے بھاگ کر چھوٹے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

اسماء اور نانا ابا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسے کیا ہوا ہے۔ اور ابھی اُس کے پیچھے قدم بڑھایا تھا کہ دروازے پر دستک سے نانا ابا اُسی سمت پلٹ گئے۔ اور اسماء یونہی اُلجھی ہوئی سی اُن کے پیچھے دیکھنے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی نانا ابا واپس اندر آئے تو اُن کے پیچھے منیب احمد تھے۔ جن پر نظر پڑتے ہی اسماء کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ وقت کا پہیہ اُلٹا چلا اور شاید زمین و آسمان گردش میں آ گئے تھے۔

''اسماء......'' نانا ابا نے اُسے پکارا تھا لیکن اتنے شور میں اُسے سنائی ہی نہیں دیا۔

''ممی......'' خرم نے بے تابی سے بڑھ کر اُسے بازوؤں میں لے لیا تو جیسے اچانک اُس کے وجود میں نئی زندگی دوڑ گئی تھی۔

''میرے بچے......'' آنسوؤں کی برسات میں وہ کبھی اُس کی پیشانی چومتی کبھی بال کبھی چہرہ ہاتھوں میں لے کر والہانہ پیار۔ بس نہیں چل رہا تھا اُسے سینے کے اندر چھپا لے۔

''میں نے آپ کو بہت ڈھونڈا۔ جب سے پاکستان آیا ہوں آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔'' خرم بھی اُس کی آغوش میں چھپ جانا چاہتا تھا۔

اس منظر سے نانا ابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ آگے بڑھ کر انھوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا پھر منیب احمد کو لے کر اندر چلے گئے۔ کیوں کہ وہ کچھ مجرم سے بنے الگ تھلگ کھڑے تھے اور کیسے بھی سہی بہرحال داماد تھے۔ اس لیے نانا ابا کو خیال کرنا پڑا۔ جب کہ اسماء کو صرف خرم نظر آ رہا تھا۔ برسوں کی پیاسی ممتا سیراب ہونے نہیں دے رہی تھی۔ آخر خرم نے انھیں لا کر برآمدے میں تخت پر بٹھایا اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کچن میں جا پہنچا اور گلاس بھر کر پانی لے آیا۔ اسماء نے اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پہلے اُس کے

ہونٹوں سے لگایا پھر خود پیا۔ تب کہیں جا کر بولنے کے قابل ہوئی تو بے اختیار پوچھا۔

''کہاں چلے گئے تھے؟''

''پاپا مجھے اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔ وہیں پلا بڑھا اور جب ایک دن پاپا نے بتایا کہ میری ماں بھی ہے جو پاکستان میں رہتی ہے بس اُس دن سے میں نے واپسی کی ٹھان لی۔ لیکن جب یہاں آکر بھی آپ نہیں ملیں تو بس مت پوچھیں یہ عرصہ میں نے کیسے گزارا ہے۔ اگر کچھ دن اور آپ نہ ملتیں تو میں مر جاتا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اسماء نے دہل کر اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں ساری زندگی تمھاری راہ دیکھتی رہی ہوں۔ پوچھنا اپنے نانا ابا سے کتنا تڑپی ہوں میں تمھارے لیے۔ اور تم مجھے کہاں کہاں ڈھونڈتے رہے۔ اپنے تایا ابا سے کیوں نہیں پوچھا۔''

''تایا ابا سے۔ کیا انھیں معلوم ہے کہ آپ یہاں رہتی ہیں۔'' خرم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''ہاں۔ شروع میں ہی تمھارے نانا ابا انھیں یہاں کا پتا دے آئے تھے اور تمھاری تائی امی کی زبانی ہی ہمیں پتا چلا کہ تم لوگ......'' اسماء ایک دم خاموش ہو گئی تو خرم سمجھ کر کہنے لگا۔

''کیا کرتے پاپا یہاں رہ کر۔ اگر آپ اُسی وقت مل جاتیں تب تو رہ سکتے تھے۔ اُس گھر میں رہنا تو ممکن نہیں رہا تھا۔ بہت غلط کیا تھا تائی امی نے۔ مجھے پاپا نے سب حالات بتائے ہیں۔ اور یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا کہ اُن کے پاس آپ کا ایڈریس تھا۔ انھوں نے میرے کئی بار پوچھنے پر بھی نہیں بتایا۔ اُس کا مطلب ہے وہ ابھی تک آپ کے خلاف دل میں بغض رکھے ہوئے ہیں۔''

''اب کیا بغض۔ اپنے مقصد میں تو کامیاب ہو گئی تھیں۔'' اسماء نے گہری سانس کھینچتے ہوئے دُکھ سے کہا کہ معماً اُسے منیب احمد کا خیال آیا کہ وہ بھی تو آئے ہیں۔

''وہ تمھارے نانا ابا کہاں ہیں۔'' وہ پاپا کہتے کہتے رہ گئی۔

''اندر ہیں۔ پاپا کے پاس۔ آیئے چلیں۔'' خرم نے اُٹھتے ہوئے کہا تو وہ نظریں چرا کر

بولی۔

''تم چلو۔ میں ذرا کچن دیکھ لوں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کیا کھاؤ گے اور وہ عروبہ کہاں گئی میرا ہاتھ ہی بٹا دیتی۔''

''عروبہ نام ہے سسٹر کا۔ وہ تو بہت ناراض ہے۔ بہت مشکل سے ہمیں لے کر آئی ہے۔'' خرم اُس کے ساتھ کچن میں چلا آیا اور پھر پوری تفصیل بتانے لگا کہ کس طرح عروبہ اُن کے آفس آئی تھی پھر وہ اُس کا پیچھا کرتا ہوا اُس کے آفس جا پہنچا تھا۔

''مجھے نہیں بتایا عروبہ نے۔'' اسماء اُس کی ساری بات سن کر بولی۔ اُسے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

''ہے کہاں؟'' خرم نے پوچھا۔

''اُدھر چھوٹے کمرے میں۔ لیکن بیٹا تم ابھی اُسے نہ چھیڑو۔ آئی تھی تو بہت رو رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں وہ تمھاری کوئی بات نہیں سنے گی۔ تم جاؤ اپنے نانا ابا کے پاس بیٹھو۔ میں بس ابھی کھانا تیار کر لوں گی۔ اسماء نے زبردستی اُسے اندر بھیج دیا پھر جلدی سے پتیلی میں چاول نکال کر بھگوئے۔ اُس کے بعد اس خیال سے کہ شاید خرم کو چاول پسند نہ ہوں تسلے میں آٹا نکال کر سیدھی ہوئی تھی کہ دروازے میں منیب احمد کو کھڑے دیکھ کر بالکل غیر ارادی طور پر وہیں بیٹھ گئی تھی۔

''کیسی ہو اسماء؟'' منیب احمد کے لہجے میں درمیانی ماہ و سال کی تھکن اُتر آئی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود جواب نہیں دے سکی۔ تو منیب احمد اُس کے قریب پنجوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''بے شک میں تمھارا مجرم ہوں۔ لیکن سزا کاٹنے کے بعد تمھارے پاس آیا ہوں۔ پھر بھی اگر تم چاہو تو میرے لیے مزید سزا تجویز کر سکتی ہو۔'' اسماء کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر آٹے میں جذب ہونے لگے تھے۔ عورت اپنے مرد کے ہاتھوں قتل بھی ہو جائے تو اُس سے اپنے خون کا حساب نہیں مانگتی۔ یہ اُس کی مجبوری ہے کہ معاف کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اُس کا نام ہی اُس کے تحفظ کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہ ضمانت نہ ہو تو مضبوط قلعے بھی امان نہیں دے سکتے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سارا دن اسماء کی منتوں سماجتوں کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ لیکن رات میں اُسے پکارتے پکارتے جب نانا ابا کی آواز بھرا گئی تب اُس نے تڑپ کر کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور خود اُس کی یہ حالت تھی کہ بھوک پیاس اور شدتِ گریہ سے نڈھال ہو رہی تھی۔

''چلے گئے وہ۔ دیکھو کوئی نہیں ہے۔'' نانا ابا نے اُسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو نہیں آئیں گے نا؟'' اُس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''بیٹا، وہ تمھارا باپ ہے اور تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ......''

''نہیں، نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔

''اچھا اچھا۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔'' نانا ابا نے فوراً سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے اُسے تسلی دی۔ جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ اب تم میری مانو جلدی سے منہ دھو کر آؤ پھر ہم کھانا کھائیں گے۔

''آپ نے کھانا نہیں کھایا۔ اتنی رات ہو گئی۔''

تمھارے بغیر کیسے کھاتا۔ تمھیں مجھ بوڑھے کا احساس نہیں ہے۔ مجھے تو ہے۔'' نانا ابا نے نرمی سے اُسے احساس دلایا تو وہ بے پناہ ندامتوں میں گھر کر کہنے لگی۔

''نانا ابا! میں سب سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہوں۔ چلیں آپ بیٹھیں میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔''

''شاباش۔'' نانا ابا اُس کا سر تھپک کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اُس نے پہلے منہ ہاتھ دھویا پھر کھانا نکال کر اندر آئی تو نانا ابا کے ساتھ اسماء کو بیٹھے دیکھ کر بے اختیار پوچھ گئی۔

''آپ نے بھی نہیں کھایا؟'' اسماء نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں بن گئی جیسے سنا ہی نہیں۔ یہ اُس کی ناراضگی کا اظہار تھا جس پر وہ ہمیشہ کی طرح خائف ہونے کی بجائے چڑ کر کہنے لگی۔

''آپ کتنی بھی ناراض ہوں۔ میں منیب احمد کو ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر وہ دوبارہ یہاں آئے تو میں اپنا انتظام کہیں اور کر لوں گی۔'' اسماء نے پریشان ہو کر نانا ابا کو دیکھا تو وہ اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے اُس سے بولے۔

''ایسے نہیں کہتے بیٹا۔ تم ابھی ناسمجھ ہو۔ بڑوں کے معاملات میں تمھیں نہیں بولنا چاہیے۔''

''بڑوں کے معاملات۔ صرف بڑوں کا معاملہ نہیں ہے نانا ابا۔ اس میں زیادہ نقصان کس کا ہوا۔ میرا، میرا۔ باپ کے ہوتے ہوئے یتیمی کی زندگی گزاری ہے میں نے اور جب میں نے اُن کے بغیر رہنا سیکھ لیا تب وہ آکر جتانا چاہتے ہیں۔'' وہ پھٹ پڑی تھی۔ ''اُن سے کہیں وہ اپنی دنیا میں مگن رہیں ہمیں اُن کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اُن کی دنیا بھی اتنی ہی محدود ہے جتنی تمھاری۔ ہاں اگر شادی کر لیتے تو......'' نانا ابا نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''یہی بتانے آئے تھے وہ کہ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ رہے تو بہت ٹھاٹ سے۔ ایک عمر گزار لی۔ اب خدمت کروانے کا وقت آیا تو دھتکاری ہوئی بیوی یاد آ گئی۔ ہونہہ......''

''ایسا نہیں ہے بیٹا۔ انھوں نے پہلے بھی بہت تلاش کیا تھا تمھاری امی کو۔'' نانا ابا اُس کی بات سے پریشان ہو گئے تھے۔

''آپ اُن کی بات کا یقین کر سکتے ہیں میں نہیں۔'' وہ کچھ سننے ماننے کو تیار نہیں تھی۔ آخر نانا ابا کو یہ موضوع ختم کرنا پڑا۔

''اچھا چلو، کھانا کھاؤ۔'' وہ سر جھٹک کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی تب اُسے اسماء کی غیر معمولی خاموشی محسوس ہونے لگی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اُس نے چاہنے کے باوجود ٹوکا نہیں اور جلدی سے کھانا ختم کر کے دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ گو کہ نیند نہیں آ رہی تھی کیوں کہ دوپہر میں روتے روتے سو بھی گئی تھی۔ اور پھر شام میں اسماء کے دروازہ پیٹنے پر ہی اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس لیے اب نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دل دماغ الگ بوجھل ہو رہے تھے۔ وہ کچھ دیر کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتی رہی پھر چائے بنانے کی غرض سے کچن میں آ گئی۔ اسماء اور نانا ابا کے دھیرے دھیرے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے کوئی توجہ نہیں دی کیوں کہ اُسے یقین تھا کہ اُن کا موضوع وہی شخص ہوگا جس نے اُسے اپنی شفقتوں سے محروم کر کے اُس

کے اندر ایسا خلا چھوڑا تھا جس میں وقت نے بے اعتباری کا زہر بھر دیا تھا کہ اُسے دنیا کا ہر شخص انہی جیسا نظر آنے لگا تھا۔ خود غرض، دھوکے باز اور فریبی۔ وہ چائے کا مگ تھامے پنجرے کے پاس آ کھڑی ہوئی اور سوئے ہوئے طوطے کو پنجرہ ہلا کر اُٹھا دیا۔

''سنو! میں بہت اداس ہوں اور مجھے غصہ بھی بہت آ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے زمین آسمان ایک کر دوں۔ کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔ میں پاگل تو نہیں ہوں۔''

''روبا۔ روبا۔'' طوطے نے پہلے پر پھڑ پھڑائے پھر چلانے لگا۔

''تم بہت اچھے ہو۔ میرے، بہت اچھے دوست۔ ہے نا۔''

''ٹیں، ٹیں، ٹیں......''

''اچھا سنو۔ کل جب میں آفس جاؤں گی نا۔ لیکن میں آفس کیسے جاؤں گی۔ میرا مطلب ہے شجیع الحسن، پتا نہیں کیا سوچا ہوگا انھوں نے، کہ میں اپنے باپ کو دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئی تھی۔ اور اگر انھوں نے پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گی، اُس نے پہلے دو جملے طوطے سے کہے تھے پھر اپنے آپ سوچنے لگی تھی۔ اور اسی نہج پر سوچتے ہوئے دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اُسے واقعی اپنی پوزیشن بڑی آکورڈ لگ رہی تھی۔ پتا نہیں منیب احمد نے شجیع الحسن سے اپنا تعارف کس انداز سے کرایا تھا۔ اور جانے اُس کے بارے میں کیا کہا ہوگا۔ یہی سب سوچ کر اُس کا آفس جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن محض اسماء اور نانا ابا پر یہ جتانے کے لیے کہ منیب احمد کی آمد اُس کی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی وہ معمول کے مطابق آفس آئی تھی۔

''میرا خیال تھا اپنے فادر کے آنے کی خوشی میں آج آپ چھٹی کریں گی۔'' شجیع الحسن نے اُس کے ستے ہوئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ وہ قصداً ذرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''کچھ عرصے کے لیے آئے ہیں آپ کے فادر، یا مستقل؟'' اُن کا انداز کریدنے والا نہیں تھا۔ لیکن وہ کیوں کہ منیب احمد سے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی اُسے لیے رُکھائی سے بولی۔

''آئی ڈونٹ نو......'' پھر فوراً احساس ہونے پر وضاحت بھی کرنی پڑی۔ ''میرا مطلب

ہے سر کہ ابھی کچھ طے نہیں ہے۔''

''ہی از ویل پرسنالٹی۔'' میں اُن سے دوبارہ ملنا چاہوں گا۔ انھوں نے کہا تو وہ اندر ہی اندر پریشان ہو گئی اور فوراً کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔

''آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ اس بار اُن کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔ جس سے اُن کا دل یکبارگی پوری قوت سے پھیل کر سمٹا تھا لیکن فوراً انجان بھی بن گئی۔

''نو سر۔ مجھے کیوں اعتراض ہوگا۔''

''سوچ لیں۔'' شجیع الحسن نے کھوجتی ہوئی نظریں اُس کے چہرے پر جما دیں۔

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ البتہ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ابھی تو وہ آئے ہیں عزیزوں رشتہ داروں سے ملیں گے۔ اجنبیوں کی باری تو بہت بعد میں آئے گی۔'' وہ بے نیازی کے ساتھ حاضر دماغی کا بھی کمال مظاہرہ کرتی تھی۔

''چلیں جب اجنبیوں کی باری آئے تو مجھے بتا دیجیے گا۔'' وہ جانے کس خیال کے تحت مسکرائے تھے۔

''تب تک میں یہاں ہوں گی ہی نہیں۔'' اُس نے سوچا اور انھیں دیکھ کر یونہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

انھیں اذعان پر غصہ آ رہا تھا جس نے اُن کی تینوں بہنوں کی موجودگی میں عروبہ کا ذکر چھیڑ کر یہ بھی بتا دیا کہ وہ اُس کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اور پھر خود آرام سے بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا۔ بلکہ اُن کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جو بہنوں کے سوالوں سے پریشان ہو رہے تھے۔

''کیسی ہے؟''

''کہاں رہتی ہے؟''

''بس ہمیں ابھی اُس کے پاس لے چلیں۔''

''تم سب کا دماغ خراب ہے۔ فضول آدمی کا یقین کر کے میری بات ہی نہیں سن

رہیں۔'' آخرانھوں نے سب کوڈانٹ دیا تو روبی رُوٹھے لہجے میں بولی۔

''کوئی نہیں۔اذعان بھائی فضول تو نہیں ہیں۔''

''ہاہاہا......''اذعان نے حسبِ عادت زوردار قہقہہ لگایا۔

''اس سے زیادہ فضول پوری دنیا میں اور کوئی نہیں۔خبر دار جو اُس کا یقین کیا۔اُسے عادت ہے کہانیاں گھڑنے کی۔''

''پھر بھی رائٹر نہیں بن سکا۔''اذعان نے فوراً ٹکڑا لگایا۔وہ مزید سلگ گئے۔

''تم کبھی کچھ نہیں بن سکتے۔''

''جو بننا تھا بن چکا البتہ مجنوں بننے کے لیے مجھے تمھاری شاگردی میں آنا پڑے گا۔'' اذعان پر اِن کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔

''شٹ اپ اور مجھے گیٹ لاسٹ کہنے پر مجبور مت کرو اذعان۔''

''بھائی پلیز غصہ تو نہ کریں۔'' ثانیہ اُن کے تیز لہجے سے خائف ہوکر منت سے بولی۔

''اذعان بھائی کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔''

''میں ایسے واہیات مذاق پسند نہیں کرتا۔'' وہ سخت آف موڈ میں کہتے ہوئے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے تھے۔

پھر رات کے کھانے پر ڈائننگ روم میں آئے تو تینوں بہنیں چپ چپ سی تھیں۔بس اُن کے بیٹھنے کا انتظار کیا اُس کے بعد اپنے اپنے بچوں کو کھلانے میں مصروف ہوگئیں۔وہ پہلے کن اکھیوں سے دیکھتے رہے پھر براہِ راست روبی کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا۔

''تم آج یہیں رہوگی نا؟'' روبی نے نفی میں سر ہلادیا۔

''کیوں۔میرا مطلب ہے رہنے میں کیا حرج ہے۔تمھارا میاں ایسے ہی ٹور پر گیا ہوا ہے۔اُس کے آنے تک یہیں رہو۔''

''ارادہ تو میرا بھی یہی تھا لیکن اب نہیں رہوں گی۔'' روبی کی صاف گوئی پر انھوں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''کیوں۔اب کیوں نہیں؟''

''آپ نے اذعان بھائی کو ناراض کردیا ہے۔'' روبی کی توضیح پر اُن کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔

''یعنی۔اذعان کی وجہ سے تم سب مجھ سے ناراض ہو۔''

''وہ ہمارے لیے ایسے ہی ہیں جیسے آپ۔'' اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے نتاشہ بول پڑی۔''اُن کی ماما کتنا چاہتی ہیں ہم سب کو۔ہمارے ہر دُکھ سکھ میں شریک ہوتی ہیں۔اتنا تو اپنوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا جتنا ماما اور اذعان بھائی خیال کرتے ہیں اور انھوں نے کبھی ہماری بات نہیں ٹالی۔آج آپ کی وجہ سے ہم انھیں کھانے کے لیے روک روک تھک گئے لیکن وہ نہیں رُکے۔'' وہ کھانا بھول کر نتاشہ کو دیکھے جارہے تھے۔

''ہمارے ایک نہیں دو بھائی ہیں۔اور دونوں میں سے کسی ایک کی ناراضگی بھی ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔آپ بتائیں کبھی ماما نے آپ میں اور اُن میں فرق کیا؟'' وہ واقعی لاجواب ہوگئے تھے۔

''آپ جب تک اذعان بھائی کو نہیں منائیں گے ہم آپ سے بھی بات نہیں کریں گے۔'' روبی نے کہا تو وہ فوراً بولے تھے۔

''اُسے منانا کوئی مشکل نہیں ہے۔'' کھانا کھالو پھر چلتے ہیں۔

''ہمیں اب گھر جانا ہے۔'' نتاشہ اور ثانیہ نے ایک ساتھ کہا۔

''وہاں سے ہوکر چلی جانا۔''

''نہیں آپ روبی کو لے جائیں۔تم چلی جاؤ روبی۔پھر مجھے فون کرکے بتانا اذعان بھائی کی ناراضگی دور ہوئی کہ نہیں۔'' نتاشہ نے روبی سے کہا۔

''فکر مت کرو۔اُس کی ناراضگی ہمارے جاتے ہی دور ہوجائے گی۔'' انھوں نے نتاشہ کو اطمینان دلایا اور خود انھیں بھی یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا لیکن جب روبی کے ساتھ اُس کے گھر گئے تو آگے اذعان نے ملنے سے ہی انکار کردیا جس پر وہ واقعی پریشان ہوگئے تھے۔اُس سے پہلے

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ اُس کی اُلٹی سیدھی باتوں پر وہ اس سے زیادہ اُسے سخت سست کہہ جاتے تھے، لیکن وہ ناراض نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اور زیادہ انہیں عاجز کرنے پر تل جاتا تھا۔ اور آج جانے اُسے کیا ہوا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے ماما کے پاس سے اُٹھ کر اُس کے کمرے کا دروازہ ناک کر رہے تھے، لیکن دروازہ کھولنا تو در کنار وہ اندر سے جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

''اب کیا کروں۔ تم کوشش کرو۔'' انھوں نے مایوس ہو کر روبی سے کہا تو اُس نے دستک کے ساتھ پکارا۔

''اذعان بھائی۔ پلیز دروازہ کھولیں۔''

''نہیں میں بہت فضول ہوں۔ جھوٹا ہوں۔ مجھے فضول کہانیاں گھڑنے کی عادت ہے۔'' اذعان نے اُن ہی کی باتیں دہرانی شروع کر دیں۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' وہ جھنجلا کر بولے تھے۔ چلو روبی کوئی ضرورت نہیں اُس کی خوشامد کرنے کی۔ یہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اُسے ذرا سی بھی اہمیت دی جائے۔

''پھر آئے کیوں۔'' اذعان نے دروازہ کھول کر چڑانے والے انداز میں کہا اور فوراً دروازہ بند کر لیا تو روبی کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''یہ ناراض ہے۔'' انھوں نے روبی کو گھورا لیکن اُس کی ہنسی نہیں رُکی۔ اور بہت ضبط کرتے کرتے اُن کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

منیب احمد چاہتے تھے کہ اسماء اپنے گھر آ جائے اور وہ ہر روز اُسے لینے کے ارادے سے جاتے تھے لیکن مایوس لوٹتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اسماء آنا نہیں چاہتی تھی وہ تو تیار تھی لیکن عروبہ نہیں مان رہی تھی۔ اور اُس کی وجہ سے اسماء بھی مجبور تھی۔ پہلے تو اپنے طور پر ہی منیب احمد کے سامنے پس و پیش کرتی رہی اور جب اُن کا اصرار حد سے بڑھا تب اُسے کہنا پڑا کہ وہ عروبہ کی وجہ سے مجبور ہے۔ اگر منیب احمد اُسے آمادہ کر لیں تو وہ چلنے کو تیار ہے۔ اور منیب احمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُسے کیسے آمادہ کریں کیوں کہ وہ تو انھیں دیکھتے ہی کمرے میں بند ہو جاتی

تھی۔ اور خرم کی لاکھ منتوں سماجتوں پر بھی دروازہ نہیں کھولتی تھی۔ اس صورت حال سے ماحول خاصا کشیدہ ہو رہا تھا۔ منیب احمد خواہ اپنے کیے پر اندر سے کتنے پشمان اور نادم ہوں، خود کو مجرم سمجھتے ہوں تھے تو اُس کے باپ اور اس حیثیت سے انھیں بیٹی کے سامنے جھکنا شاید گوارا نہیں تھا۔ اس لیے اُس کے بند دروازے پر خود دستک دینے کی بجائے خرم سے کہتے تھے۔ اس وقت بھی اُن کے اشارے پر خرم اُٹھ کر گیا تو وہ نانا ابا سے کہنے لگے۔

''عروبہ خواہ مخواہ ضد کر رہی ہے۔ آپ اُسے سمجھاتے کیوں نہیں۔''

''کوشش تو کرتا ہوں لیکن وہ کچھ سننے پر تیار ہی نہیں ہوتی۔'' نانا ابا نے اس معاملے میں خود کو بے بس ظاہر کیا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد منیب احمد اسماء کو متوجہ کر کے کہنے لگے۔

''میرا خیال ہے عروبہ کو یہیں اپنے نانا کے پاس رہنے دو۔ تم چلو ہمارے ساتھ۔''

''نہیں۔ میں اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔'' اسماء فوراً بولی تھی۔

''چھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے۔ کیا بچے اپنے ننھیال، دادھیال میں رہتے نہیں ہیں۔ یہی سمجھنا کہ وہ ننھیال میں ہے۔ آ جائے گی کچھ دنوں میں۔ تم دیکھنا تمھارے جانے کے بعد......''

''نہیں۔'' اسماء اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔ میں جانتی ہوں اُسے۔ وہ ضدی نہیں ہے خوف زدہ ہے۔ اُسے ہمیشہ یہ خوف رہا ہے کہ کبھی آپ آ کر اُس سے اُس کی ماں کو چھین نہ لیں اور آپ وہی بات کر رہے ہیں۔''

''پھر بتاؤ میں کیا کروں۔ ادھر خرم الگ پریشان ہے۔ اُسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔ ہر روز یہاں سے مایوس لوٹتے ہوئے اُس کی جو حالت ہوتی ہے وہ......'' منیب احمد نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی تب ہی خرم اندر آتے ہوئے بولا۔

''وہ نہیں سن رہی پاپا۔ میں نے اُسے یہاں تک کہا ہے کہ ہم ممی کو لے کر جا رہے ہیں تب بھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''ہوں......'' منیب احمد نے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی تھی۔

''آپ کیا سوچنے لگے۔'' خرم نے پوچھا۔ وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''چلو بیٹا۔ زندگی رہی تو کل پھر آئیں گے۔ اوکے اسماء۔'' اسماء عاجزی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ جیسے معاف کردو میرے اختیار میں کچھ نہیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں ممی۔ میں صبح آؤں گا آپ کے پاس۔'' خرم نے ماں کو تسلی دی پھر باپ کے پیچھے چل پڑا۔

''مجھے روبا کی سمجھ نہیں آرہی پاپا۔ اُس کے اندر وہ شوق کیوں نہیں ہے جو مجھے تڑپاتا رہا اور اس وقت تک چین نہیں لینے دیا جب تک میں ممی کے پاس نہیں پہنچ گیا۔'' خرم نے اُلجھتے ہوئے کہا تھا۔

''اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے بیٹا۔ میں اگر تمھارے سامنے تمھاری ممی کی غلط تصویر پیش کرتا تو تمھارے اندر شوق کی بجائے نفرت اور تنفر ہوتا جو روبا کے دل میں ہمارے لیے ہے۔'' منیب احمد مسلسل ناکامی کے بعد اپنی سطح سے بہت نیچے آگئے تھے۔

''آپ کا مطلب ہے......'' خرم نے غیر یقینی سے انھیں دیکھا تھا۔

''ہاں۔ میری بچی کو مجھ سے متنفر کیا گیا ہے اور ایسا کرنے والے غیر نہیں اپنے ہیں۔'' منیب احمد سخت شاکی ہو رہے تھے۔

''اگر آپ کا اشارہ ممی کی طرف ہے پاپا تو میں آپ کی بات سے اختلاف کروں گا۔ ممی ایسا نہیں کرسکتیں۔ وہ بہت بڑے ظرف کی مالک ہیں۔ انھوں نے آپ کو معاف کردیا۔ پھر بھی آپ اُن سے شاکی ہو رہے ہیں۔ خرم کو منیب احمد کا شاکی ہونا بالکل اچھا نہیں لگا اور ماں کے لیے اُس کی محبت اور جذبات فطری تھے۔ منیب احمد نے چونک کر اُسے دیکھا پھر جیسے سنبھل کر بولے تھے۔

''نہیں نہیں بیٹا۔ میرا اشارہ تمھاری ممی کی طرف نہیں ہے۔ وہ تو خود آنا چاہتی ہیں اور آجائیں گی ایک دو دن میں۔''

''عروبہ کے بغیر......؟'' خرم کا انداز بے حد سادہ تھا۔

''نہیں وہ بھی آئے گی۔ میں لے کر آؤں گا اُسے۔''

منیب احمد کی آنکھیں کسی خیال سے چمکنے لگی تھیں اور لہجہ قدرے پُراسرار ہوگیا تھا۔

''لیکن پاپا وہ تو بات ہی نہیں سنتی۔ مجھ سے کیوں خفا ہے۔ میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو خود اُس کی طرح......''

''ریلکس بیٹا ریلکس۔'' منیب احمد نے آہستہ سے اُس کا کندھا تھپکا۔ ''تم کیوں ڈس ہارٹ ہو رہے ہو وہ یہاں آئے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور ہاں تم نے اپنی ممی کو شبنم کے بارے میں بتایا ہے؟''

''نہیں اور بتاؤں گا بھی نہیں۔''

''کیوں؟'' منیب احمد سمجھ کر ہی انجان بن گئے۔

''بس پاپا میں اب ممی کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ گو کہ مجھے یقین ہے کہ وہ میری محبت میں شبنم کے ساتھ میری شادی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گی لیکن پھر ہمیشہ انھیں یہ احساس رہے گا کہ تائی جی نے انھیں ایک بار پھر شکست دے دی، اور میں اپنی ماں کو شکست خوردہ نہیں دیکھنا چاہتا۔'' خرم ایک دم بہت سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''ہوں......'' منیب احمد پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اس میں شبنم کا کیا قصور ہے۔''

''میرا کیا قصور تھا، یا عروبہ کا۔ پھر ہمیں کس بات کی سزا ملی۔ والدین کا کیا ہمیشہ اولاد ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آئی ایم سوری پاپا، شاید آپ کو میری بات بُری لگے لیکن ایسا ہی ہوتا ہے۔'' خرم نا چاہتے ہوئے بھی انھیں الزام دے گیا تھا۔

اور منیب احمد جو پہلے عروبہ کے رویے سے پریشان تھے اب خرم کی بات سے بوکھلا گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اولاد اُن کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ اُن کے خیال میں جو زیادتی انھوں نے اسماء کے ساتھ کی تھی اُس کی سزا وہ طویل بن باس کی صورت کاٹ چکے ہیں۔ اور کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا۔ اسماء کے معاملے میں تو واقعی اُن کی سزا کے دن تمام ہوچکے تھے لیکن اولاد کے حصے میں جو محرومی آئی تھی اُس کا ازالہ ایک دم سے ممکن

نہیں تھا۔ اور منیب احمد اولاد کے اس حق کو تسلیم کرنے کی بجائے اُلٹا اُن کے رویوں کو اپنے خلاف سازش سمجھنے لگے تھے کہ بچوں کو اُن سے متنفر کیا جا رہا ہے، اور اس بار انھوں نے خرم کے سامنے اس بات کو دہرایا نہیں بلکہ کچھ محتاط سے ہو گئے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ خرم انھیں مزید الزام دیتا وہ اُسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ اور اسماء کے ساتھ عروبہ کو اس گھر میں لانے کی تدبیر سوچنے لگے۔ مسئلہ یہ تھا کہ عروبہ اُن کا سامنا ہی نہیں کرتی تھی جو وہ اُسے قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ نرمی کے ساتھ کچھ سختی بھی کی جا سکتی تھی لیکن وہ سامنے آتی تب نا۔ اور اب انھیں اسماء ہی کے ذریعے کوئی ایسی بات کہنی تھی جسے سن کر وہ اپنی ضد چھوڑ کر اُن کے ساتھ آنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس رات وہ بہت دیر تک اُسی نہج پر سوچتے رہے تھے۔ اور نہ صرف خود غرض ہو گئے تھے بلکہ اس بات کو انا کا مسئلہ بھی بنا لیا تھا۔ شاید بھول گئے تھے کہ ایک طویل عرصہ انھوں نے خود کو اسماء کا مجرم سمجھتے ہوئے ندامتوں اور ملامتوں میں گزارا تھا۔ یہی انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز جب تک اُسے حاصل نہیں ہوتی اُس کے لیے بے چین رہتا ہے، اور بڑے بڑے دعوے بھی اِسی دوران ہوتے ہیں جو حصول کے بعد یادداشت سے یوں محو ہو جاتے ہیں جیسے کبھی گمان میں بھی نہیں تھے۔ منیب احمد کا بھی یہی حال تھا۔ اور شاید اس لیے کہ اسماء نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے مرحلے پر ہی انھیں معاف کر دیا تھا۔ یہ اُن کے حق میں اچھا ہوا تھا یا بُرا بہر حال وہ اب اُس کا ناجائز فائدہ اُٹھانے جا رہے تھے۔

"مس منیب۔" اشفاق صاحب نے دروازے میں آ کر اُسے پکارا تو وہ کمپیوٹر کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر انھیں دیکھنے لگیں۔

"سر کا کوئی فون تو نہیں آیا۔" اشفاق صاحب نے پوچھا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُس کی نظریں گلاس وال سے اُدھر بھٹک گئیں۔ شجیع الحسن موجود نہیں تھے۔ اُس نے دوبارہ اشفاق صاحب کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"سر آج نہیں آئیں گے کیا؟"

"پتا نہیں۔ بارہ بج چکے ہیں۔ فون بھی نہیں کیا انھوں نے۔" اشفاق صاحب پُر سوچ انداز میں بولے تھے۔

"ہاں فون تو کرنا چاہیے تھا۔" اُس نے یونہی کہہ دیا۔

"کتنے کام رُکے ہوئے ہیں۔ خصوصاً یہ فائل تو آج ہی سائن کروانی ہے۔" اشفاق صاحب نے اُس کی ٹیبل پر رکھی ایک فائل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

"جی۔ کل اُس کے بارے میں انھوں نے مجھے تاکید بھی کی تھی کہ میں یہ ضرور مکمل کر کے اُن سے سائن کروا لوں۔"

"یہ کام آج ہی کی تاریخ میں ہونا چاہیے۔"

"میں کر سکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے میں نے تو تمام کاغذات اس میں لگا دیے ہیں۔ اب آگے......" اُس نے بات اُدھوری چھوڑ کر کندھے اُچکائے، جیسے اُس کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اشفاق صاحب سمجھ کر وہیں سے واپس پلٹ گئے، تو اُس نے بہت ریلیکس ہو کر چیئر کی بیک پر سر رکھ لیا کیوں کہ سامنے شجیع الحسن موجود نہیں تھے۔ اُن کی خالی چیئر کو دیکھتے ہوئے وہ خود کلامی کے انداز میں بولنے لگی تھی۔

"چلو چھٹی ہوئی۔ اللہ کرے دو چار دن اور نہ آئیں......" ٹیلی فون کی بیل بج اُٹھی جس پر اُس نے بُرا سا منہ بنا کر سر جھٹکا۔ پھر بے دلی سے ریسور اُٹھایا تھا۔

"یس......"

"مس عروبہ میں نے گاڑی بھجوا دی ہے۔ آپ ڈرائیور کے ساتھ آ جائیں۔" دوسری طرف شجیع الحسن تھے۔

"کہاں سر؟" وہ یک دم اٹینشن ہو گئی تھی۔

"میرے گھر۔ پلیز مائنڈ نہیں کیجیے گا۔ وہ گرین فائل اور لیٹر پیڈ ساتھ لے آئیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔" انھوں نے بلانے کی وضاحت کی تو نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے کہنا پڑا۔

"نیور مائنڈ سر۔ میں آ رہی ہوں۔"

"تھینک یو......" اُدھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ ریسور رکھ کر بڑبڑائی۔

"ایک دن کام نہیں ہو گا تو پتا نہیں کیا ہو جائے گا۔ ہونہہ۔" پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ شجیع الحسن کے شان دار بنگلے میں داخل ہوئی تو ہر سو پھیلی خاموشی نے اُسے قدرے خوف زدہ کر دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اُن کے بارے میں کچھ غلط انداز سے سوچتی، دینو بابا آ گئے۔

"صاحب اپنے کمرے میں ہیں بیٹی وہیں چلی جاؤ۔" دینو بابا نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

"اُن کا کمرہ۔"

"وہ ادھر ہے۔" دینو بابا نے اشارے سے بتایا۔

"سو تو نہیں رہے۔" اُس نے جاتے جاتے رُک کر پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی میں انھیں سوپ دے کر آیا ہوں۔ آپ کا پوچھ رہے تھے۔ آپ اُن کے دفتر سے آئی ہو نا۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اُن کے کمرے کی طرف چل پڑی اور دروازے کے قریب رُک کر تصدیق کی غرض سے پلٹ کر دینو بابا کو دیکھا لیکن اتنی سی دیر میں وہ جانے کس سمت غائب ہو گئے تھے۔ تب اُس نے آہستہ سے دستک دی اور کم اِن کی آواز پر اندر داخل ہو کر بولی۔

"اسلام علیکم سر۔" شجیع الحسن اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سر کے اشارے سے جواب دیا اور بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

"آپ کی طبیعت۔" وہ بیٹھتے ہوئے بس اسی قدر بولی تھی۔

"ہوں۔ بس اچانک......" وہ بھی اُدھورا جواب دے کر خاموش ہو گئے تو کچھ دیر رُک کر اُس نے فائل اُن کی طرف بڑھا دی جیسے لے کر وہ اُس کے صفحے اُلٹنے میں لگ گئے۔

وہ بالکل غیر ارادی طور پر انھیں یوں دیکھنے لگی تھی کہ نظریں اُن کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ بے نام سی تپش تھی جس نے شجیع الحسن کو چونکایا تھا۔ اور وہ بے ساختہ اُس کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائے تو وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی اور فوراً نظروں کا زاویہ بدل کر اندر ہی اندر خود کو

سرزنش کرنے لگی تھی۔ کہ وہ اُسے مخاطب کر کے بولے۔

"مس عروبہ! پین دیجیے سائن کر دوں۔"

"پین۔" وہ اپنا بیگ کھول کر اس میں پین تلاش کرنے لگی۔ اور ہمیشہ تو پین موجود ہوتا تھا شاید ابھی بھی تھا لیکن بوکھلاہٹ میں مل ہی نہیں رہا تھا۔

"سوری سر۔" آخر مایوس ہو کر اُس نے تلاش ترک کر کے انھیں دیکھا تو وہ سامنے ریک کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

"وہاں دیکھیں۔" وہ فوراً اُٹھ کر ریک کے پاس گئی اور پین اُٹھا کر انھیں تھما دیا۔ پھر دوبارہ بیٹھی تو اس خیال سے سر جھکا لیا کہ کہیں پھر نہ کوئی حماقت ہو جائے۔

"ہوں......" تمام پیپرز سائن کرنے کے بعد شجیع الحسن اُس کی طرف متوجہ ہوئے اور اُسے متوجہ کرنے کی خاطر ہوں کی آواز نکالی۔ وہ فوراً سر اونچا کر کے بولی۔

"یس سر......"

"کیا پییں گی۔ چائے یا......؟"

"نو تھینک یو۔ کچھ نہیں۔" اُس نے سہولت سے منع کیا۔ وہ سامنے وال کلاک پر نظر ڈال کر بولے۔

"چائے نہ کولڈ ڈرنک لنچ ٹائم میں لنچ اور پلیز منع مت کیجیے گا۔"

"لیکن سر......"

"اوں ہوں......" وہ ٹوک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے لے کر ڈائننگ ہال میں آئے تو اُن کے بیٹھتے ہی دینو بابا نے کھانا لگا دیا۔ وہ کچھ پریشان سی ہو کر کبھی ٹیبل پر نظر ڈالتی کبھی انھیں دیکھتی۔

"کیا بات ہے......؟" انھوں نے ٹوکا۔ وہ جز بز سی ہو کر بولی۔

"وہ اور لوگ۔ آئی مین......"

"کوئی نہیں ہے۔" انھوں نے فوراً کہہ کر ڈش اُس کے سامنے کر دی۔

"آپ اکیلے رہتے ہیں۔" وہ بلا ارادہ پوچھ گئی۔

"نہیں۔ دینو بابا ہیں۔"

"اور آپ کے پیرنٹس، بہن بھائی۔؟"

"پیرنٹس اللہ کو پیارے ہو چکے۔ بہنیں ماشاءاللہ اپنے گھروں کی ہیں۔ اور بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔" انھوں نے مختصراً بتا دیا۔

"اور آپ نے......" وہ اُن کی شادی کا پوچھنے جا رہی تھی لیکن جانے کیوں خاموش ہو گئی۔ اور وہ غالباً سمجھ گئے تھے جب ہی اپنے آپ کہنے لگے۔

"میری بہنوں کا کہنا ہے کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ کیوں کہ اب مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو مجھے اُن سے اتفاق نہیں تھا شاید اس لیے کہ میں نے کبھی اپنے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور اب عالم یہ ہے کہ سوچنے کے لیے صرف اپنی ذات رہ گئی ہے۔" اپنی بات ختم کر کے وہ ذرا سا ہنسے ہوں جیسے کتنی عجیب بات ہے اور وہ بے دھیانی میں انھیں دیکھنے لگی تھی اپنی پلیٹ پر جھک گئیں اور جو تھوڑا سا سالن نکالا تھا اسی پر تھوڑے سے چاول نکال کر چمچ سے کھانے لگی۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔ اُس کے ذہن میں مزید کوئی سوال نہیں تھا اور نہ کوئی تجسس۔ اتنی باتیں بھی اُس نے بس بات کرنے کی غرض سے کر لی تھیں۔ جب کہ اُس کے برعکس شجیع الحسن اُس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے لیکن یہ خیال بھی تھا کہ کہیں وہ مائنڈ نہ کرے اس لیے خاصے محتاط انداز میں پوچھا تھا۔

"آپ انگیج ہیں؟"

"نہیں۔" اُس نے مختصر جواب دے کر پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور چند گھونٹ لینے کے بعد گلاس رکھتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں بولی۔

"مجھے انگوٹھی پہننے سے سخت چڑ ہے بلکہ نفرت۔"

"انگوٹھی پہننا کوئی ایسا ضروری تو نہیں ہے اُس کے بغیر بھی......"

"مجھے چلنا چاہیے۔" وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شجیع الحسن

اُس کے دامن بچانے پر ذرا سا مسکرائے۔ پھر رومال سے ہاتھ صاف کر کے اُٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کہاں جائیں گی۔ آفس یا گھر۔"

"ظاہر ہے آفس۔ کیوں کہ ابھی پانچ نہیں بجے ورنہ یہاں سے مجھے گھر جانے میں آسانی ہوتی۔" وہ سرسری انداز میں بولتے ہوئے ڈائننگ ہال سے نکل کر رک گئی جیسے یہیں سے باہر نکلنے کا ارادہ ہو۔

"چلیں میں ڈرائیور سے کہتا ہوں پہلے آپ کو گھر چھوڑ دے گا۔"

"تھینک یو۔" وہ کچھ عجلت کا مظاہرہ کر گئی اور احساس ہوا بھی تو رُکی نہیں۔ وہیں سے باہر نکل آئی تھی۔

تین بج رہے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اُسے دیکھتے ہی پنجرے میں اُس کا مٹھو چلانے لگا۔

"روبا۔ روبا۔"

"آج جلدی آ گئی تمھاری روبا۔" وہ برآمدے میں تخت پر اپنا بیگ پھینکتے ہوئے بولی تھی کہ کمرے سے نکل کر نانا ابا نے اُسے ٹوکا۔

"آہستہ بولو۔ تمھاری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"امی۔ کیا ہوا امی کو۔" وہ یک دم پریشان ہو گئی۔

"تمھیں کیا۔" نانا ابا واپس اندر چلے گئے تو وہ اُن کے جواب سے مزید پریشان ہو کر اُن کے پیچھے بھاگی آئی اور اسماء کے قریب ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگی۔ اسماء کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا اور ساکت وجود میں سانسوں کی آمد و رفت بھی برائے نام لگ رہی تھی۔ اُس نے گھبرا کر نانا ابا کا بازو تھام لیا۔

"نانا ابا کیا ہوا ہے امی کو۔ یہ ایسے کیوں لیٹی ہیں۔"

"بے ہوش ہے۔ ابھی ڈاکٹر انجکشن لگا کر گیا ہے۔ اور اُس نے منع کیا ہے اُٹھانے کو۔ تم ہٹ جاؤ اُس کے پاس سے۔" نانا ابا نے اُسے اپنی طرف کھینچا لیکن وہ مچل گئی۔

"نہیں۔ میں نہیں ہٹوں گی۔ مجھے اُن کے پاس رہنے دیں۔"

"اُسے ہوش میں تو آنے دو۔ چلو ادھر۔" نانا ابا اُسے کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے۔

"نانا ابا پلیز۔ مجھے بتایئے کیا ہوا ہے امی کو۔ صبح تو اچھی بھلی تھیں۔" وہ رونے والی ہوگئی تھی۔"

"آرام سے بیٹھو اس طرح کرو گی تو میں۔" نانا ابا نے وارننگ کے انداز میں اسی قدر کہا تھا کہ وہ فوراً بیٹھ گئی۔ اور بہت بے بسی سے انھیں دیکھنے لگی۔ تب نانا ابا اُس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"تمھاری ضد نے اُسے اس حال کو پہنچایا ہے۔"

"میری ضد...... وہ سمجھی نہیں۔"

"ہاں تمھاری ضد۔ تم اپنے باپ کے گھر نہیں جانا چاہتیں اور وہ تمھاری وجہ سے مجبور ہے۔ تم چھوڑ دو ضد ورنہ تمھارا باپ اُسے طلاق دے دے گا۔ یہی کہہ گیا ہے آج وہ اور صرف تین دن کی مہلت دے گیا ہے کہ اگر تم اور اسماء اُس کے ساتھ نہیں گئیں تو وہ طلاق دے کر سارا قصہ ہی ختم کردے گا۔"

"ہاں تو کر دیں ختم۔ دے دیں طلاق۔" وہ یک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"تو پھر ابھی رولو اپنی ماں کو، وہ زندہ نہیں رہے گی۔" نانا ابا غصے سے گویا ہوئے تھے۔

"اسی طلاق کے ڈر سے تو وہ اُس گھر سے نکلی تھی اور اب اس عمر میں تم وہی داغ اُس کے ماتھے پر لگوانا چاہتی ہو جب کہ وہ اس خوف سے زندگی سے دور ہو رہی ہے۔"

"نہیں......" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

"روتی کیوں ہو۔ جاؤ کہہ دو منیب احمد سے کہ کل کی بجائے ابھی طلاق بھیج دیں تاکہ

تمھاری ماں......"

"خدا کے لیے نانا ابا آگے کچھ نہ کہیں میں مرجاؤں گی۔"

"تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔" نانا ابا اُٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے رُک کر بولے تھے۔ تین دن ہیں تمھارے پاس۔ اچھی طرح سوچ لو اور یہ مت بھولنا کہ منیب احمد تمھارا باپ ہے تم اُس سے نہیں جیت سکتیں۔"

"میرے خدا......" نانا ابا کے کمرے سے نکلتے ہی اُس نے تکیے میں منہ چھپا لیا تھا۔ میں نے ہار جیت کا کھیل تو نہیں کھیلا تھا۔ نہ ہی میرا مقصد منیب احمد کو توڑنا، یا جھکانا تھا۔ میں تو اُس شخص سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتی، محبت کا نہ نفرت کا۔ دوستی نہ دشمنی۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں سوچ لیا۔ سراسر بلیک میلنگ اور یہ امی کتنی نادان ہیں ابھی بھی اُن سے تعلق قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ اسماء کا خیال آتے ہی اُس نے تکیہ دور پھینک دیا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اُس کے کمرے میں آئی تو نانا ابا نے اُسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارا کر دیا، جیسے یکسر نظر انداز کر کے وہ اسما کے قریب آ بیٹھی اور اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پکارنے لگی۔

"امی۔ امی۔"

"صبر نہیں ہے تم میں۔" نانا ابا نے دبے لہجے میں ٹوکا لیکن اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

"امی۔ آنکھیں کھولیں امی۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی جو آپ کہیں گی، خدا کے لیے اٹھیں۔" اُس کے آنسو اسماء کے چہرے پر گر رہے تھے جس سے وہ پہلے ذرا سا کسمسائی پھر آنکھیں کھول کر اُسے دیکھنے لگی۔ اُلبتہ ذہن بیدار نہیں ہوا تھا جب ہی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔

"میں آپ کے ماتھے پر داغ نہیں لگنے دوں گی۔ آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں بس آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔" وہ جو منہ میں آیا بولے جا رہی تھی اور اسی روانی سے اُس کے آنسو چھلک رہے تھے۔ اس پل نانا ابا کو اُس پر بے

طرح رحم آیا اور منیب احمد پر غصہ جنھوں نے اُن کی اس چھوٹی سی دنیا کا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ کتنے خود غرض تھے وہ۔ اُن کا دل چاہا اس بار وہ خود اسماء اور عروبہ کو لے کر کہیں دور چلے جائیں کہ پھر منیب احمد انھیں کبھی تلاش نہ کر سکیں۔

"نانا ابا! امی بولتی کیوں نہیں۔" اُس نے عاجزی سے نانا ابا کو دیکھا تو وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"بولے گی بیٹا۔ بولے گی۔ تم پریشان مت ہو اور دیکھو تمھارے رونے سے یہ بھی پریشان ہو رہی ہے۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو اور ہاں تم نے کھانا کھایا کہ نہیں۔"

"کھالیا۔"

"تو چلو چائے بنالو۔ اُٹھو شاباش۔" نانا ابا نے اُسے زبردستی وہاں سے اُٹھا دیا تھا۔

کتنی مجبور اور بے بس ہوگئی تھی وہ اور اب اُس وقت کو پچھتا رہی تھی جب منیب احمد کے آفس میں اپنی پہچان کرانے کے ساتھ یہ بھی جتا آئی تھی کہ اُن کے بغیر اُس کی زندگی اچھی گزری ہے اور گزر رہی ہے۔

"کاش میں اُن کے سامنے نہ جاتی تو وہ ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔" اس رات اُس کی ہر سوچ کا اختتام اسی بات پر ہو رہا تھا۔

پھر صبح وہ معمول کے مطابق اُٹھ گئی اور جلدی سے ناشتا بنا کر اسماء کے پاس لے آئی۔ گو کہ اُس کا اپنا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کچھ کھانے کو لیکن اسماء کی خاطر اُسے خود پر بہت جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ اور ابھی تو ابتدا تھی آگے جانے کیا کچھ اُسے سہنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ یوں ظاہر کرتی رہی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ ناشتے کے دوران نانا ابا کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، جب کہ اسماء بالکل خاموش تھی۔ ایک دو بار اُس نے مخاطب بھی کیا لیکن اسماء کی خاموشی نہیں ٹوٹی اور اُس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اُس نے زیادہ زور بھی نہیں دیا البتہ اُسے سنا کر نانا ابا سے کہنے لگی۔

"نانا ابا! ہمارے جانے کے بعد تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔ کتنی تکلیف ہوگی آپ کو کھانے وغیرہ کی۔ ایسا کریں آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

"نہیں بیٹا۔ تمھارے ساتھ میں بہت رہ لیا۔ اب سکھر جاؤں گا تمھاری خالہ کے پاس۔" نانا ابا نے کہا تو اُس نے فوراً پوچھا۔

"ہمیشہ کے لیے؟"

"ہاں۔ اب زندگی رہ ہی کتنی گئی ہے۔"

"سو سال۔ سو سال اور جینا ہے آپ کو۔ کیوں امی میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" وہ پھر بے ساختہ اسماء کو مخاطب کر گئی اور جواب میں اُس کی خاموش نظریں دیکھ کر اُس کا ضبط جواب دینے لگا۔ فوراً وہاں سے اُٹھ گئی اور دوپہر کے لیے کھانا تیار کر کے آفس کے لیے نکلی تھی۔ کیوں کہ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بے شک منیب احمد کے گھر چلی جائے لیکن اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دے گی۔ البتہ نئے گھر سے اپنی روٹین سیٹ کرنے میں اُسے کچھ وقت ضرور لگنا تھا، اس لیے اُس نے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست لکھ کر شجیع الحسن کے سامنے رکھ دی اور کیوں کہ اُس نے چھٹی کا سبب نہیں لکھا تھا اس لیے وہ درخواست دیکھنے کے بعد اُسے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کہیں جا رہی ہیں۔"

"نو سر۔"

"پھر......؟"

"میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اُسے فوری طور پر یہی جواز سمجھ میں آیا تھا۔

"گھر میں اور کوئی نہیں ہے......؟"

"نانا ابا ہیں۔ لیکن وہ کھانا وغیرہ تو نہیں پکا سکتے۔"

"اور آپ کے فادر۔ وہ بھی یہیں ہیں، یا واپس چلے گئے؟"

"یہیں ہیں۔" جانے کس خیال سے اُس کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں اُبھر آئی تھیں جنھیں دیکھ کر شجیع الحسن یہی سمجھے کہ اُسے اُن کا ذاتی سوال کرنا اچھا نہیں لگ رہا جب ہی اُس کی درخواست پر سائن کرتے ہوئے بولے۔

"اوکے۔ ایک ہفتہ اُس سے زیادہ نہیں۔"

"اگر ایک دن بھی زیادہ ہو گیا تو پھر سمجھ لیجیے گا کہ میں نے جاب چھوڑ دی۔ وہ بلا ارادہ کہہ گئی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اُن کے تیز لہجے پر وہ ٹپٹا گئی۔

"سوری سر۔ میں کچھ غلط کہہ گئی۔ فی الحال میرا جاب چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر اچانک ایسا کوئی پروگرام بن گیا......"

"تب بھی ایک مہینہ پہلے آپ کو مطلع کرنا ہوگا۔" انھوں نے فوراً اُس کی بات پوری کی۔

"یس سر......" وہ اندر ہی اندر جز بز ہو گئی تھی۔

"کہاں جا رہے ہو......؟" منیب احمد نے خرم کو عجلت میں جاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ممی کے پاس۔ آپ چلیں گے......؟" خرم رُک کر انھیں دیکھنے لگا۔

"نہیں۔ اور تم بھی ابھی مت جاؤ۔"

"کیوں پاپا......؟"

"بس ہے کوئی بات جبھی میں منع کر رہا ہوں۔ اور ضروری نہیں ہے کہ میں ہر بات کی وضاحت کروں۔ تم بس دو دن صبر کرو پھر تمھاری ممی یہیں آجائیں گی۔" منیب احمد نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پا کر کہا۔

"سچ کہہ رہے ہیں آپ۔" خرم کو یقین نہیں آیا۔

"ہاں مجھے یقین ہے کہ پرسوں جب میں جاؤں گا تو تمھاری ممی اور عروبہ میرے ساتھ آنے کو تیار ہوں گی۔" منیب احمد کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے پاپا۔ لیکن آپ مجھے کیوں منع کر رہے ہیں۔"

"تمھارے جانے سے وہ اپنا ارادہ بدل سکتی ہیں۔ اس لیے تمھیں سمجھنا چاہیے بیٹا کہ اگر یونہی ہر روز تم اور میں وہاں جاتے رہیں گے تو پھر انھیں یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوگی خصوصاً

تم تو انھیں مل ہی آتے ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" منیب احمد نے دھیرج سے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو خرم پُرسوچ انداز میں بولا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں پاپا لیکن......"

"لیکن ویکن کے چکر میں مت پڑو۔ اور پھر میں تمھیں دو دن انتظار کرنے کو کہہ رہا ہوں زیادہ تو نہیں۔ میری بات مان لو۔"

"اوکے۔ دوست کے پاس تو جا سکتا ہوں، یا وہاں بھی نہیں۔" خرم نے اُن کی بات مان کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ مسکرا کر بولے۔

"کیوں نہیں۔ ضرور جاؤ۔" البتہ کھانے سے پہلے آجانا میں انتظار کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" خرم باہر نکل گیا۔ منیب احمد مطمئن سے ہو گئے تھے۔ اور پھر جو یقین انھوں نے خرم کو اسماء اور عروبہ کے آنے کا دیا تھا اسی یقین کے ساتھ وہ مقررہ دن انھیں لینے گئے تو آگے واقعی اسماء تیار کھڑی تھی۔ بیماری اور کمزوری کے باوجود اور یہ اُس کی مجبوری تھی جس سے فائدہ اُٹھا کر منیب احمد ذرا بھی نادم نہیں تھے۔ اُس کے برعکس اپنی جیت سمجھ کر بہت خوش لیکن مصلحتاً خوشی کا اظہار نہیں کیا اور خود کو اس سلسلے میں مجبور ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"مجھے افسوس ہے اسماء کے تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے مجھے ایسی بات کہنی پڑی جس سے تمھیں یقیناً دکھ ہوا ہوگا لیکن میں بھی کیا کروں۔"

"میں نے آپ سے کوئی شکوہ تو نہیں کیا۔" اسماء کمزور سی آواز میں بولی تھی۔

"تم بہت اچھی ہو۔ میری اس خطا کو بھی معاف کر دینا اور ہاں عروبہ کہاں ہے اور ابا وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے نا؟"

"نہیں۔" اسماء نے مختصر جواب دے کر عروبہ کو پکارا۔

"جی امی۔" عروبہ کمرے سے نکلی اور آگے منیب احمد کو دیکھ کر وہیں رُک گئی۔

"چلو بیٹا، تمھارے پاپا آگئے ہیں۔ نانا ابا کو بلاؤ۔" اسماء نے اُس سے کہا۔ وہ وہیں سے پلٹ گئی۔ پھر نانا ابا کے ساتھ باہر آئی تو اُس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں

طوطے کا پنجرہ۔

نانا ابا نے آگے بڑھ کر اسماء کے سر پر ہاتھ رکھ کر ڈھیروں دعائیں دی یوں جیسے وہ ابھی ابھی اُن کے گھر سے رُخصت ہو رہی ہو۔ عروبہ بہت خاموشی سے اس منظر کو دیکھتی رہی۔ پھر اسی خاموشی سے اسماء اور نانا ابا کے پیچھے باہر نکلی تھی۔

''آپ اکیلے کیسے رہیں گے۔ ہمارے ساتھ چلیں۔'' منیب احمد نانا ابا سے کہہ رہے تھے اور پتا نہیں انھوں نے کیا جواب دیا وہ سن نہیں سکی کیوں کہ اسماء نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

''اُف کتنا ظالم ہے یہ شخص بلکہ سارے مرد ہی ایسے ظالم ہوتے ہیں۔ طلاق جیسا ہتھیار اپنے ہاتھ میں رکھ کر ساری زندگی عورت سے اپنی جائز ناجائز منواتے ہیں۔ میں کبھی کسی کے ہاتھوں ایسا کھلونا نہیں بنوں گی۔ کبھی نہیں۔'' تمام راستہ وہ ایسی ہی سوچوں میں گھری رہی تھی، جب گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تب اُس نے چونک کر دیکھا۔ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا شان دار بنگلہ تھا جس کا اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ حالات نے اُسے بہت کم عمری میں ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا اور پھر منیب احمد سے تو وہ پہلے ہی متنفر تھی اس لیے کوئی چیز اُسے متاثر نہیں کر رہی تھی۔ بالکل روبوٹ بن گئی تھی۔ جس سمت منیب احمد اشارہ کرتے اُسی سمت چل پڑتی اور پہلے وہ اُس کمرے میں آئے تھے جو انھوں نے اُس کے لیے مخصوص کیا تھا۔

''یہ بیٹا آپ کا کمرہ ہے۔'' منیب احمد نے اُس کے سپاٹ چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تو اُس نے بس اتنا کیا کہ ہاتھ میں پکڑا بیگ وہیں چھوڑ دیا۔

''یہ کمرہ خرم نے آپ کے لیے منتخب کیا ہے اور اُسے ڈیکوریٹ بھی اُسی نے کروایا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو ٹھیک ورنہ جہاں آپ کا دل چاہے۔ آئی مین سارا گھر آپ کا ہے۔'' منیب احمد نے اپنے تئیں اُسے خوش کرنا چاہا لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا تو اسماء اس خیال سے کہ کہیں منیب احمد محسوس نہ کریں اُن کا دھیان ہٹانے کی خاطر پوچھنے لگی۔

''خرم کہاں ہے......؟''

''وہ ابھی آفس سے نہیں آیا۔ ایک ضروری میٹنگ تھی اس لیے دیر ہو گئی ورنہ اس وقت تک آ جاتا ہے۔ چلو میں فون کرتا ہوں اُسے۔'' منیب احمد کہتے ہوئے کمرے سے نکلے تو اسماء اُس سے سرگوشی میں بولی۔

''تم بھی آؤ۔''

''نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں، آپ جائیں۔'' وہ کھڑکی کی طرف بڑھ گئی اور پردے ہٹا کر طوطے کا پنجرہ وہیں رکھ دیا۔ پھر اسماء کے جانے کے بعد اس سے بولی۔

''سنو! مجھے بھی اُڑنا سکھا دو۔ پھر ہم دونوں یہاں سے فلائی کر جائیں گے۔ لیکن نہیں میں کہاں جا سکتی ہوں امی کو چھوڑ کر۔ تم جانا چاہتے ہو تو میں تمھیں آزاد کر دیتی ہوں۔ پھر میں باتیں کس سے کروں گی۔ نہیں تم نہیں جاؤ گے۔ سمجھے تم نہیں جاؤ گے۔'' خلاف عادت طوطے نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ بس آنکھیں جھپک جھپک کر اُسے دیکھتا رہا۔ تو وہ اُس کے پنجرے پر ہاتھ مار کر بولی۔

''بے شک ناراض ہو جاؤ۔ میں تمھیں آزاد نہیں کروں گی۔'' تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ فوراً سیدھی کھڑی ہو گئی اور پلٹ کر دیکھا تو خرم اندر آتے ہوئے بولا۔

''اسلام علیکم اور خوش آمدید۔''

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''سسٹر! سلام کا جواب دینا تو فرض ہے۔ فرض ہی نبھا دو۔ ویسے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مجھ سے کس بات پہ ناراض ہو۔ میں تو خود تمھاری طرح ہر بات سے لاعلم تھا بلکہ تم سے بھی زیادہ۔ خیر چھوڑو۔ جو وقت گزر گیا اُسے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔'' خرم بولتے ہوئے اُس کے قریب آ کر رُک گیا پھر آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

''تم میری بہت اچھی بہن ہو۔ پلیز مجھ سے دوستی کر لو۔ میں تمھیں بہت ساری شاپنگ کراؤں گا اور ساتھ آئس کریم بھی کھلاؤں گا۔''

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ ناراضگی سے کہہ کر بیڈ پر جا بیٹھی۔

''مجھے تو ہے۔'' خرم بے ساختہ بولا تھا۔

''میں کیا کروں۔''

''سب سے پہلے ناراضگی ختم کرو اُس کے بعد اور بہت کچھ کرنا ہے۔ دیکھو میں تمھارا بڑا بھائی ہوں اس طرح تمھاری خوشامد کرتا ہوا اچھا لگ رہا ہوں کیا۔''

''تو میں نے کہا ہے خوشامد کریں۔ اُس کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

''کہا تو نہیں لیکن۔ اچھا چلو کھانا لگ چکا ہوگا باقی باتیں وہیں کریں گے۔'' وہ یوں بولا جیسے اب تک وہ بڑے خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی۔

''آپ جائیں مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔''

''ڈائننگ تک جاتے جاتے بھوک لگ جائے گی۔ چلو اُٹھو۔'' خرم نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اُٹھا دیا تھا۔

شجیع الحسن ٹہلتے ہوئے ٹیرس پر آ بیٹھے تھے۔ اور کبھی کی پڑھی ہوئی نظم جانے کیسے اس وقت انھیں یاد آنے لگی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی نظروں کے سامنے خوب صورت منظر بننے لگے تھے۔ جن کی دل کشی میں کھو کر گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ بس احساسات پر نرم نرم پھوار پڑ رہی تھی۔

ایک لڑکی ابابیل سی
دھوپ میں دس بجے پر فشاں
ایک خوشبو کے جھونکے کے ہمراہ اُڑتے ہوئے
راستے میں ملی اور اک آن میں بے نشاں ہوگئی
آنکھ میں تتلیوں کے چرائے ہوئے رنگ ٹپکا گئی

''زندہ ہو یا......'' اذعان نے تیسری بار پکارنے کے بعد آخر اُن کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا تو جھٹکا لگنے سے وہ جانے کس دنیا سے واپس لوٹے تھے۔ پھر اذعان کو دیکھ کر ناگواری

سے بولے۔

''تم ہمیشہ بے وقت آتے ہو۔''

''تو کوئی ایک وقت بتا دو جو تمھارے نزدیک بے وقت نہ ہو۔'' اذعان نے اُن کے قریب چیئر کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیسے آئے......؟'' وہ اُس کی بات نظر انداز کر گئے۔

''اپنی گاڑی سے۔ کیوں نہیں چاہیے گاڑی۔''

''لاحول ولا۔ میں کام پوچھ رہا ہوں۔'' وہ جھنجھلا گئے۔

''کیا مطلب ہے تمھارا۔ یعنی تمھارے پاس میں صرف کام سے ہی آ سکتا ہوں۔ ذرا اس سے پہلے میں کس کام سے آیا تھا اور اُس سے پہلے۔''

''بس۔ خدا کے لیے پوری زندگی کا حساب مت مانگو۔ میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں۔'' انھوں نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اذعان نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا پھر آواز دبا کر معنی خیز لہجے میں پوچھنے لگا۔

''کہاں کھوئے ہوئے تھے......؟''

''جانتے تو ہو پھر کیوں پوچھ رہے ہو۔'' پہلی بار انھوں نے بُرا نہیں مانا۔ شاید اس لیے کہ اُس ابابیل سی لڑکی کے بارے میں بہت ساری باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

''ہاں۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ اس حال کو پہنچ گئے ہو کہ اپنا ہوش ہی بھلا بیٹھے ہو۔ یار شادی کیوں نہیں کر لیتے اُس سے۔ وہ راضی نہیں، یا کوئی اور مسئلہ ہے۔'' اب اذعان بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''مسئلہ۔ پتا نہیں یار کیا مسئلہ ہے۔ میں ابھی تک اُسے پرپوز نہیں کر سکا۔'' بار بار اس موضوع کی طرف آیا لیکن وہ خوب صورتی سے دامن بچا گئی۔

''کہیں انگیج تو نہیں......؟'' اذعان نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......''

''تمھیں کیا پتا......؟''

''میں نے پوچھا تھا اُس سے۔ انگیج نہیں ہے۔''

''پھر کیوں دامن بچا رہی ہے۔ ہاں ایک بات ہو سکتی ہے اُس کے گھر میں اُس سے بڑی اور بہنیں ہوں گی اس وجہ سے وہ......''

''نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔'' وہ اذعان کی بات کاٹ گے۔

''ایسا بھی نہیں ویسا بھی نہیں ہے پھر کیسا ہے۔'' اذعان اُلجھ گیا تھا۔

''جیسا بھی ہوگا وقت آنے پر سب معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال تو میں خود کچھ نہیں سمجھ پا رہا۔'' وہ اُس کے ساتھ قافیہ ملا کر محظوظ انداز میں مسکرائے۔

''مثلاً کیا سمجھنا چاہتے ہو......؟'' اذعان گویا اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔

''سب سے پہلے تو یہ کہ اُسے جاب کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ اُس کے فادر نہ صرف ویل ایجوکیٹڈ بلکہ ویل بزنس مین بھی ہیں۔'' انھوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم ملے ہو اُس کے فادر سے......؟'' اذعان نے فوراً پوچھا۔

''ہاں۔ ایک روز آئے تھے اُسے لینے۔ بتا رہی تھی طویل عرصے بعد پاکستان آئے ہیں پتا نہیں یہیں ہیں یا واپس چلے گئے۔ بہر حال بہت اٹریکٹو پرسنالٹی تھی اُن کی۔'' اُن کی نظروں میں وہی منظر تھا جب منیب احمد اُن کے آفس آئے تھے۔

''تو کیا اب تم اُن کے دوبارہ پاکستان آنے کا انتظار کرو گے؟'' اذعان نے اُن کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ تین دن انتظار کے بھی بہت کٹھن لگ رہے ہیں۔'' انھوں نے صاف گوئی سے کہہ کر گہری سانس کھینچی تھی۔

''کیا مطلب ہے......؟'' اذعان سمجھا نہیں تو وہ اُسے دیکھ کر کہنے لگے۔

''یار وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔ چار دن گزر چکے ہیں اور باقی تین دن ہیں۔ یقین کرو میں نے زندگی میں کبھی کسی بات کو اتنا نہیں سوچا جتنا ان چار دنوں میں اُس کے بارے میں سوچا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ اب اُس کے سامنے آتے ہی میں خود پر اختیار کھو دوں گا۔''

''ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ بس اُسے دیکھتے ہی کہہ دینا کہ مجھے تم سے شدید قسم کی محبت ہوگئی ہے اور میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ فوراً مجھ سے شادی کر لو ورنہ۔ ورنہ۔ ورنہ کیا کرو گے تم۔''

''تمھارا سر توڑ دوں گا۔'' وہ خاصے محظوظ ہو رہے تھے۔

''نہیں پلیز۔ یہ اُس سے مت کہنا۔'' اذعان نے انتہائی معصوم بن کر تنبیہ کی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑے۔

''شاباش۔ اِسی طرح ہنستے رہا کرو۔ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور ہاں تمھاری باتوں میں اپنی بات تو بھول ہی گیا۔ میں کل جرمنی جا رہا ہوں۔'' اذعان نے اچانک یاد آنے پر بتایا۔

''مشینری کے سلسلے میں......؟'' انھوں نے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں اور وہاں کی مارکیٹ میں اپنی مصنوعات متعارف کرانے کا بھی پروگرام ہے۔''

''تو کیا زیادہ دنوں کے لیے جا رہے ہو؟''

''بہت زیادہ بھی نہیں۔ بس ایک مہینہ یا ہو سکتا ہے اس سے بھی پہلے واپسی ہو جائے۔ بہر حال تم ماما کا خیال رکھنا۔ آئی مین اُن کے پاس آتے جاتے رہنا۔''

''یہ تمھیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ہمیشہ کی طرح اطمینان سے جاؤ اور ہو سکے تو وہیں سے ایک عدد دلہن اپنے ساتھ لیتے آنا وہ اسی پر خوش ہو جائیں گی۔'' انھوں نے کہا۔

''تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ماما کو خوش کر چلا ہوں۔'' اذعان کہہ کر ہونٹ بھینچ گیا تھا۔

''کیسے......؟'' وہ یک دم متجسس ہو گئے۔

''وہ ایسے کہ ماما آج کل لڑکیاں دیکھنے میں لگی ہوئی ہیں اگر میرے واپس آنے تک انھیں کوئی پسند آگئی تو بس پھر ہم دونوں ساتھ ہی شادی کریں گے۔ کیا خیال ہے......؟''

''بالکل ٹھیک......'' انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

وہ بہت بور ہوگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔ حالانکہ منیب احمد اور خرم سارا دن تو گھر میں نہیں رہتے تھے۔ صرف اسماء ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ اور اسماء اُس سے زیادہ کچھ یوں نہیں کہتی تھی کہ جانتی تھی وہ اُس کی وجہ سے مجبور ہو کر آئی ہے اور اس بات سے وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے شرمندہ بھی تھی۔ اس لیے فی الحال اُسے اُس کا کمرے میں بند رہنا ہی غنیمت لگ رہا تھا۔ بہر حال وہ بہت بور ہوگئی تھی اور اس وقت اپنے آفس سے چھٹی لینے پر پچھتا رہی تھی۔ جس طرح بند کمرے میں گزشتہ چار دن کٹے تھے اُس کے بعد باقی تین دنوں کا تصور بڑا اذیت ناک تھا۔

''تین دن، میں تو مر جاؤں گی۔'' اُس نے سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بج رہے تھے۔

''باقی چھٹی کینسل۔ کہہ دوں گی شجیع الحسن سے کہ امی اب بالکل ٹھیک ہیں۔ اس لیے اُسے مزید چھٹی کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ایک دم فیصلہ کر کے اُٹھی اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلی تو اسماء غالباً منیب احمد اور خرم کو سی آف کر کے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

''امی! میں آفس جا رہی ہوں۔'' اُس نے قریب آ کر کہا۔

''آفس۔'' اسماء نے چونک کر اُسے یوں دیکھا جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہی ہو۔

''جی۔ چھٹی تو میں نے ایک ہفتے کی لی تھی لیکن چار دنوں میں ہی بور ہوگئی ہوں اس لیے میں نے سوچا......''

''لیکن بیٹا تمھارے پاپا شاید اب پسند نہ کریں۔'' اسماء نے دبے لہجے میں ٹوکا۔ اُس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔

''مجھے اُن کی پسند ناپسند سے کوئی سروکار نہیں۔ میں یہاں آ گئی ہوں تو اُس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُن کی پابند ہوگئی ہوں۔ آپ کہہ دیجیے گا اُن سے کہ میرے کسی معاملے میں مداخلت نہ کریں۔''

''میں یہ سب اُن سے نہیں کہہ سکتی۔'' اسماء نے بے بسی سے معذوری ظاہر کی۔

''میں خود کہہ دوں گی۔ اگر انھوں نے روکا تو...... چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔'' وہ اپنا بیگ سنبھالتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔

اُس کا خیال تھا کہ وہ شجیع الحسن کے آنے سے پہلے ہی آفس پہنچ جائے گی لیکن اتفاق تھا کہ وہ جلدی آ گئے تھے۔ اُسے کوریڈور میں ہی اشفاق صاحب نے بتا دیا تھا۔ اس لیے وہ سیدھی اُن کے کمرے میں چلی آئی اور سلام کرنے کے ساتھ ہی کہنے لگی۔

''سر! میری باقی چھٹی کینسل کر دیں۔''

شجیع الحسن جو اُسے دیکھتے ہی خوش گوار سے احساس میں گھر گئے تھے۔ مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بے اختیار بولے تھے۔

''تھینک گاڈ......'' پھر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کی والدہ کی طبیعت اب کیسی ہے......؟''

''بالکل ٹھیک۔ اس لیے تو میں آ گئی ہوں۔''

''گڈ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب آپ اپنی جاب میں سنجیدہ ہوگئی ہیں اور اب مجھے آپ کی پرموشن بھی کرنی پڑے گی۔'' انھوں نے کہا تو وہ خوش ہو کر بولی۔

''تھینک یو سر۔ میں جاؤں۔''

''کہاں......؟''

''اپنی سیٹ پر۔'' اُس نے کہا تو وہ اپنی بے اختیاری پر خجل سے ہو گئے اور اُسے جانے کا بس اشارہ کر دیا۔

وہ اُن کی خجالت پر اندر ہی اندر محظوظ ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اور کیوں کہ گزشتہ دنوں کا بھی کافی کام تھا اس لیے لنچ ٹائم تک اُسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملی۔ اور پھر اُس کا لنچ کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے ایک کپ چائے منگوالی اور ابھی پہلا سپ لیا تھا کہ شجیع الحسن نے گلاس ڈور پر اُنگلی سے دستک دینے کے بعد اُسے پورا کھول دیا۔ وہ فوراً

اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''یس سر۔''

''ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ آئی مین آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''ابھی۔'' اُس نے کچھ شش و پنج میں گھر کر پوچھا۔

''ابھی۔ اگر آپ لنچ نہیں کر رہیں تو آ جائیں۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اُس نے جلدی سے بیگ کندھے پر لٹکایا پھر اُسی عجلت میں چائے کا بڑا سا گھونٹ لے کر اُن کے پیچھے بھاگی آئی تھی۔

''شجیع الحسن ڈرائیور سے چابی لے کر خود ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے اور اُس کے لیے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کسی میٹنگ میں لے جا رہے تھے اور جانے میٹنگ کس کے ساتھ اور کہاں تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر یہ اُس کا مسئلہ نہیں ہے ارادہ ترک کر دیا۔

''آپ کے فادر ابھی یہیں ہیں، یا واپس چلے گئے۔'' پارکنگ سے گاڑی نکال کر مین روڈ پر آتے ہی انھوں نے ویو مرر میں اُسے دیکھ کر پوچھا۔

''یا اللہ۔ انھیں پتا نہیں میرے باپ سے کیا دل چسپی ہے۔'' اُس نے سوچا پھر بڑی بے دلی سے جواب دیا۔

''یہیں ہیں۔''

''یہاں کیا مصروفیات ہیں اُن کی......؟''

''بزنس۔ وہ مستقل یہیں آگئے ہیں اور اپنا بزنس بھی سیٹ کر چکے ہیں۔''

''اچھا، پھر آپ!'' وہ جانے کیوں خاموش ہو گئے اور وہ سمجھ کر کہنے لگی۔

''میں جاب کیوں کر رہی ہوں یہی پوچھنا چاہ رہے ہیں نا آپ۔ تو معاف کیجیے گا سر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اور میں اپنے ذاتی معاملات کسی کے ساتھ ڈسکس کرتی ہوں نہ شیئر۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولی تھی۔

''یہ آپ اپنے ساتھ زیادتی کرتی ہیں۔'' وہ کہے بغیر رہ نہیں سکے۔

''ہو سکتا ہے۔'' وہ بے نیازی سے سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شجیع الحسن نے کیسٹ آن کر دی۔

میرا دل بھی کتنا پاگل ہے
یہ پیار تمہی سے کرتا ہے

''میرے خدا......'' اُس کا دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ کہیں وہ لمحہ تو نہیں آگیا جس سے وہ بُری طرح خائف تھی۔ اُن کے سامنے ہتھیار ڈالنا چاہتی تھی نہ انھیں ہرٹ کرنا۔ اس لیے مسلسل اپنے گرد حصار کھینچنے میں لگی رہی تھی۔ پھر اُن کے ساتھ فائیو سٹار ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے وہ خاصی کنفیوز ہو گئی تھی۔ اور پہلے سے ریزرو ٹیبل پر بیٹھتے ہی پوچھنے لگی۔

''سر وہ میٹنگ......؟''

''میٹنگ ہی ہے۔ میری آپ کے ساتھ۔'' انھوں نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''جی۔'' وہ سمجھی نہیں، یا سمجھ کر انجان بنی تھی۔

''اگر میں آپ کو لنچ کی دعوت دیتا تو کیا آپ قبول کرتیں۔'' انھوں نے اُس کا جی نظر انداز کر کے پوچھا۔ وہ جز بز سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

آئی ایم سوری۔ آپ کو یہاں لانے کے لیے مجھے کچھ غلط بیانی سے کام لینا پڑا۔'' کھانا سرو ہونے کے بعد وہ اُسے متوجہ کر کے کہنے لگے۔ ''اصل میں مجھے آپ سے کچھ ایسی باتیں کرنا تھیں جو آفس میں بیٹھ کر کرنا مجھے کسی طرح مناسب نہیں لگا۔ آپ پلیز اپنا موڈ ٹھیک کریں اور پہلے کھانا کھائیں اُس کے بعد......''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

''میرا ساتھ۔''

''نہیں۔'' وہ پھر ٹوک گئی۔ شجیع الحسن ہونٹ بھینچ کر اُسے دیکھنے لگے۔ کتنی کٹھور لگ رہی

تھی وہ۔ اُن کا دل چاہا اُسے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالیں تا کہ وہ اپنے گرد کھڑی دیواروں سے باہر نکل آئے۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پانے کے بعد وہ کولڈ ڈرنک اُٹھا کر اُس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔

''یہ تو پی سکتی ہیں یا نہیں۔'' اُس نے خاموشی سے ٹھنڈی یخ بوتل ہاتھ میں لے کر اسٹرا ہونٹوں سے لگالیا۔ انھوں نے ایک نظر ٹیبل پر سجے لوازمات پر ڈالی پھر ویٹر کو بلا کر سب اُٹھانے کا کہہ کر سگریٹ سلگانے لگے۔ جس سے وہ اپنے رویے پر نادم تو ہوئی لیکن ظاہر نہیں کیا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ آپ اتنی انجان ہو سکتی ہیں۔'' قدرے توقف سے وہ اپنے آپ کہنے لگے۔ کیوں کہ محبت وہ جذبہ ہے جو اظہار کا محتاج نہیں اور میں اظہار کا قائل بھی نہیں تھا لیکن آپ کے رویے نے مجھے مجبور کر دیا۔ اس لیے بغیر کسی تمہید کے صاف لفظوں میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور بلاشبہ میری زندگی میں آنے والی آپ پہلی لڑکی ہیں۔ جسے میں نے اپنی تنہائیوں میں سوچا ہے۔ مجھے غلط نہیں سمجھیے گا۔ میں نے زندگی کے کسی معاملے میں کبھی بے ایمانی نہیں کی۔ ابھی بھی پوری ایمان داری سے آپ کو پرپوز کر رہا ہوں۔

اُس نے دھیرے سے پلکیں اُٹھا کر انھیں دیکھا تھا۔

حصّہ سوم

WWW.PAKSOCIETY.COM

o

شجیع الحسن کے لہجے کی سچائیاں اُس کے اندر ہلچل مچانے لگی تھیں۔
جذبوں کی تپش تھی جس میں اُس کا وجود پگھلنے لگا تھا۔
اُس کا دل چاہا اعتراف کے طور پر اُن کا ہاتھ تھام لے اور اس خوب صورت راہ گزر پر چلتی چلی جائے۔ دور بہت دور نکل جائے۔ جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ ہو اور اگر ہو بھی تو وہ نظریں چرا جائے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جس لمحے سے وہ خائف تھی اُس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ اور قریب تھا کہ اُن کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی کہ اچانک اسماء کا خیال آ گیا جس نے طویل برس ایک مرد کی بے اعتنائی میں سسکتے گزارے تھے۔ وہ ہرگز نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ سیاہ راتیں جن کے نصیب میں سحر تھی ہی نہیں۔
''میرے خدا......'' وہ جو ہاتھ اُن کی طرف بڑھانے جا رہی تھی اُس کی اُنگلیاں اپنی پیشانی پر رکھ کر خود کو سرزنش کرنے لگی تھی۔
شجیع الحسن بغور اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر اترتے خوب صورت رنگوں میں انھیں اپنی بات کا جواب مل گیا تھا لیکن اُس کی دوسری کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"عروبہ، کیا ہوا ہے۔" انھوں نے بہت اپنائیت سے پکار کر پوچھا۔

"میں گھر جاؤں گی۔" وہ فوراً پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر بولی۔

"او کے۔ میں کچھ نہیں کہہ رہا نہ ہی اپنی بات کے جواب پر ابھی اصرار کروں گا، آپ اچھی طرح سوچ لیں۔" انھوں نے دھیرج سے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں سوچنا۔" وہ بہت اپ سیٹ ہو رہی تھی۔

"تو کیا میں سمجھ لوں کہ آپ نے میرا پرپوزل قبول کر لیا ہے۔" انھوں نے بڑی آس سے اُسے دیکھا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ اپنے ازلی تنفر سے کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تو ایک لحظہ کو اُن کا چہرہ تاریک ہوا تھا۔ پھر فوراً خود پر قابو پا کر ویٹر کو بلایا اور بل پے کر کے اُٹھتے ہوئے بولے۔

"چلیں۔" وہ اُن سے پہلے باہر نکل آئی۔ اور جب اُن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی تب وہ کہنے لگے۔

"گو کہ میں نے کوئی ناجائز، یا انہونی بات نہیں کی۔ سیدھے صاف لفظوں میں اعتراف کے ساتھ پرپوز کیا ہے پھر بھی اگر آپ کو بُرا لگا تو آئی ایم سوری۔ اور پلیز اُس بات کو بنیاد بنا کر آپ جاب چھوڑنے کا مت سوچیئے گا۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو میں بہت گلٹی فیل کروں گا۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا......؟" اس نے ذرا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"ابھی کہاں جائیں گی گھر، یا آفس۔" قدرے رُک کر انھوں نے پوچھا۔

"آفس۔" وہ مختصر جواب دے کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"تھینک یو......" انھوں نے گہری سانس سینے کے اندر روک کر ایک نظر اُسے دیکھا۔ پھر پوچھنے لگے۔ "آپ خفا تو نہیں ہیں۔"

"نہیں......" وہ جانے کیوں آزردگی میں گھر گئی تھی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟"

"یہی پوچھیں گے نا کہ......" وہ بے اختیار اُن کی طرف گردن موڑ کر بس اِسی قدر کہہ کر

خاموش ہو گئی۔

"کہ......" انھوں نے ٹوکا تو وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ سمجھ گئی ہیں لیکن بتانا نہیں چاہتیں۔ او کے ایز یو لائک۔" انھوں نے ایک دم گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی اور بقیہ راستہ منٹوں میں طے کر لیا تھا۔

اسماء اپنے گھر آ کر خوش تو تھی لیکن عروبہ کے رویے سے اُسے دھڑکا بھی لگا رہتا تھا کہ کسی دن منیب احمد اُس سے باز پرس نہ کرنے لگیں اور جواب میں وہ بدتمیزی کر جائے۔ گو کہ وہ ایسی تھی نہیں لیکن حالات نے اُس کے اندر تلخی بھر دی تھی، اور وہ من مانی بھی کرنے لگی تھی۔ جیسے آج آفس چلی گئی تھی اور یہ بھی کہہ گئی تھی کہ منیب احمد کا اُس کے کسی معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسماء کے لیے یہ بات مزید تشویش کا باعث تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُسے کیسے سمجھائے۔ اس وقت وہ اسی پریشانی میں بیٹھی تھی کہ ملازم نے آ کر کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ تو وہ پوچھنے لگی۔

"کون ہیں......؟"

"پتا نہیں۔ بیگم صاحبہ۔ شاید پڑوس سے آئی ہیں۔" ملازم نے کہا۔

"انھیں ڈائنگ روم میں بٹھاؤ میں آ رہی ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی، ملازم چلا گیا۔

اُس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ چہرہ مرجھایا ہوا، بال پریشان۔ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں برش پھیرا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آئی تو آگے گریس فل سی خاتون کو دیکھ کر خاصی کنفیوز ہو گئی۔ کیوں کہ وہ پُر اعتماد نہیں تھی۔

"اسلام علیکم! میں بیگم شیرازی ہوں۔ یہیں قریب ہی رہتی ہوں۔" خاتون نے سلام اور تعارف میں پہل کی۔

"وعلیکم سلام......" اسماء صرف سلام کا جواب دے سکی اور انھیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود

بھی بیٹھ گئی۔

''مجھے آج ہی ملازمہ نے بتایا کہ منیب صاحب کی فیملی یہاں آگئی ہے تو میں نے سوچا مل آؤں۔'' بیگم شیرازی کے نرم لہجے سے وہ متاثر ہو کر پوچھنے لگی۔

''ساتھ والے بنگلے میں رہتی ہیں آپ......؟''

''نہیں۔ اس روڈ کے اینڈ میں کارنر کا بنگلہ ہے۔ آپ آئیے گا نا۔''

''جی ضرور......'' اُس نے زیادہ گردن ہلائی تھی۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے......؟'' بیگم شیرازی نے پوچھا۔

''دو۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔''

''ماشااللہ۔ پڑھتے ہیں......؟'' بیگم شیرازی کو دھان پان سی اسماء کسی طرح بھی جوان بچوں کی ماں نہیں لگ رہی تھی۔

''نہیں۔ بیٹا تو منیب صاحب کے ساتھ ہوتا ہے اور بیٹی گریجویشن کر چکی ہے بلکہ جاب بھی کر رہی ہے۔'' اسماء نے بتایا تو بیگم شیرازی حیران ہوئیں۔

''جاب کیوں......؟''

''اُس کا شوق ہے۔'' اب اسماء یہی کہہ سکتی تھی۔

''اچھا شوق ہے۔ لیکن پھر آپ تو سارا دن اکیلی ہوتی ہوں گی۔'' بیگم شیرازی نے سراہ کر کہا۔

''جی......''

''میں بھی اکیلی ہوتی ہوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے اذعان۔ آج کل جرمنی گیا ہوا ہے بزنس ٹوور پر۔'' بیگم شیرازی خود ہی بتانے لگیں۔ ''جب سے اذعان کے والد کا انتقال ہوا ہے میں بہت وہمی ہوگئی ہوں۔ خاص طور سے بیٹے کے معاملے میں۔ بس چاہتی ہوں ہر وقت نظروں کے سامنے رہے اور وہ اتنا ہی دور بھاگتا ہے۔ شاید مجھے ستاتا ہے۔''

''تو آپ شادی کر دیں اُس کی......'' اسماء بے ساختہ بولی تھی۔

''ہاں اب یہی کرنا ہے۔'' بیگم شیرازی کا چہرہ اذعان کی شادی کے خیال سے کھل گیا

تھا۔ تب ہی عروبہ دروازے میں آ کر بولی۔

''امی آپ یہاں ہیں......'' وہ پہلے اسماء کو کمرے اور کچن میں دیکھتی ہوئی آ رہی تھی جب ہی اسماء کو دیکھ کر بولی۔ پھر اُس کے ساتھ بیٹھی خاتون پر نظر پڑی تو واپس پلٹنے لگی تھی لیکن اسماء نے پکار لیا۔

''آؤ بیٹا۔ کیا کہنا تھا۔''

''کچھ نہیں۔'' پھر بیگم شیرازی کو دیکھ کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، یہ آپ کی بیٹی ہے۔'' بیگم شیرازی نے اُسے جواب دے کر اسماء سے پوچھا۔

''جی۔'' اسماء عروبہ کو دیکھ رہی تھی اور اُسے چائے بھجوانے کا اشارہ کیا تو وہ سر ہلا کر وہیں سے پلٹ گئیں۔

''ماشااللہ بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی۔ بالکل نہیں لگ رہا کہ یہ اتنا عرصہ لندن میں رہی ہے۔'' بیگم شیرازی نے کہا تو اسماء حیران ہوئی۔

''لندن۔''

''میری ایک دو بار منیب صاحب سے رفیع صاحب کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے ہی بتایا تھا کہ طویل عرصہ لندن میں رہے ہیں۔ اور ابھی ایک دو سال ہوئے یہاں شفٹ ہوئے۔'' بیگم شیرازی نے اسماء کی حیرت پر وضاحت کی۔

''جی ایسا ہی ہے۔'' اسماء اب سنبھل کر بولی تھی۔

''آپ آئیے گا نا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' بیگم شیرازی بہت اپنائیت کا اظہار کر رہی تھیں اور عروبہ کو دیکھ کر تو وہ اور زیادہ مشتاق ہوگئی تھیں کیوں کہ آج کل وہ اذعان کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔

''شکریہ میں ضرور آؤں گی۔'' اسماء اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

''چائے وغیرہ کا تکلف رہنے دیں۔'' میں انشااللہ پھر آؤں گی۔'' بیگم شیرازی نے اُس کے اُٹھنے سے سمجھ کر کہا۔

"بس دو منٹ۔" اسماء بہت عجلت میں گئی تھی۔

دُکھ کی بات تو تھی کہ وہ جو انھیں بہت اپنی اپنی لگنے لگی تھی وہ اُن کی بننے پر آمادہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ اور جانے کیوں انھیں لگ رہا تھا جیسے کوئی مجبوری اُس کا راستہ روکے ہوئے ہے ورنہ وہ انھیں ناپسند نہیں کرتی۔ یہ بات اکثر انھوں نے محسوس کی تھی کہ جب وہ بے دھیانی میں انھیں دیکھتی تھی اور اُن کے ایک دم متوجہ ہونے پر اُس کے چہرے پر جو رنگ اُترتے تھے وہ اُس کے اندرونی جذبوں کو ظاہر کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُس کا بوکھلانا اور انجان بن جانا اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ پھر بھی انھیں یقین تھا کہ وہ اُن کا پرپوزل ریجکٹ نہیں کرے گی اور یہ اُن کا اپنی ذات پر غرور نہیں بلکہ اپنے جذبوں پر ایمان تھا۔ اس لیے اُس کے انکار کو وہ عام مردوں کی طرح اپنی توہین نہیں سمجھ رہے تھے۔ اُس کے برعکس یہ خیال آرہا تھا کہ ہوسکتا ہے وہ اُس کے معیار پر پورے نہ اُترتے ہوں۔ اور یہ یقیناً اُن کی اعلیٰ ظرفی تھی جو وہ اُسے الزام نہیں دے رہے تھے البتہ دُکھ ضرور تھا کہ وہ پہلی لڑکی تھی جسے انھوں نے پوری ایمان داری سے چاہا اور اپنے تمام جذبے اُس کے نام لکھ دیئے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ دل کی ویرانی بڑھنے لگی اور اس وقت گھر جانے کے خیال سے ہی وحشت ہونے لگی تو وہ نتاشہ کے گھر چلے آئے۔ خیال تھا کہ اُس کے بچوں کے ساتھ دھیان بٹ جائے گا لیکن آگے دنوں بچے اپنے باپ کے ساتھ کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ سخت مایوس ہوئے اور چاہا کہ کھڑے کھڑے نتاشہ سے مل کر لوٹ جائیں لیکن یہ کہاں ممکن تھا۔ اتنے دنوں بعد اُس کے گھر آئے تھے وہ چھوٹتے ہی شکوہ کرنے لگی تھی جس سے وہ فوری واپسی کا ارادہ ترک کر کے بیٹھتے ہوئے بولے۔

"اسی لیے نہیں آتا کہ تم بولتی بہت ہو۔ چائے بھی ایک گھنٹے بعد پوچھو گی۔"

"جی نہیں۔ میں فوراً چائے لے آؤں گی۔ آپ بہت آرام اور اطمینان سے بیٹھیں کیوں کہ رات کے کھانے سے پہلے میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔" نتاشہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل گئی تو وہ اسی وقت جانے کا بہانہ سوچنے لگے۔

کچھ دیر بعد نتاشہ چائے لے کر آئی تو وہ اُس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"کہاں لے گئے ہیں آصف بچوں کو......؟"

"کہیں دُور نہیں گئے بس آتے ہی ہوں گے۔" نتاشہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھائی آپ ب تک ہمارے بچوں سے دل بہلائیں گے اب اپنا سوچیں۔ آخر آپ شادی کیوں نہیں کرتے۔"

"میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔" انھوں نے ٹالا۔

"ارے۔ یہ آپ کب سے ہاتھ کی لکیروں پر یقین کرنے لگے۔" نتاشہ ہنسی تھی۔

"شروع سے کرتا ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولے تھے۔

"بس رہنے دیں۔" مجھے اذعان بھائی نے سب بتا دیا ہے آپ جس لڑکی کو پسند کرتے ں وہ آپ کے آفس میں کام کرتی ہے۔ ہیں نا......؟" نتاشہ نے جتا کر اپنی بات کی تصدیق ی چاہی۔

"اذعان کو بکواس کرنے کی عادت ہے۔ اوہ یاد آیا مجھے ماما کے پاس جانا ہے۔" اذعان ے ذکر پر انھیں جانے کا بہانہ بھی سوجھ گیا فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہائیں۔ آپ تو منہ سے بات نکالتے ہی کھڑے ہوگئے۔ آصف کو تو آنے دیں اُن ے مل کر جایئے گا۔"

"پھر آجاؤں گا۔ ابھی ماما کے پاس جانا ضروری ہے۔ اصل میں اذعان جرمنی گیا ہوا ہے ر ماما بے چاری اکیلی ہیں۔ اچھا چلتا ہوں۔" وہ بڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکلے تھے ر پندرہ منٹ میں ہی ماما کے پاس پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"میں ابھی تمھیں ہی یاد کر رہی تھی۔"

"دیکھ لیں آپ نے یاد کیا اور میں آگیا۔" انھیں حقیقتاً ماما کے پاس آکر بہت سکون ملتا تھا۔

"میں نے کچھ دیر پہلے تمھارے گھر فون کیا تھا۔ بابا نے بتایا تم ابھی تک آفس سے نہیں ئے۔ خیریت اتنی دیر تک آفس میں۔" ماما نے انھیں اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں آفس سے تو جلدی نکلا تھا۔ وہاں سے نتاشہ کی طرف چلا گیا۔ آپ کو کوئی کام

تھا۔" انھوں نے پوچھا۔

"نہیں۔کام تو کوئی نہیں البتہ ایک خوش خبری سنانی ہے تمھیں۔ پہلے یہ بتاؤ کھانا کھاؤ گے؟"

"بالکل بھوک نہیں ہے ماما۔بس آپ جلدی سے خوش خبری سنائیں۔" انھوں نے ماما خوشی دیکھتے ہوئے دل چسپی ظاہر کی۔

"ہاں۔خوشی کی خبر یہ ہے کہ اذعان شادی کے لیے آمادہ ہوگیا ہے اور مجھے اُس کے لیے ایک لڑکی بھی پسند آگئی ہے۔" ماما نے بہت خوش ہو کر بتایا۔وہ بھی خوش ہو گئے۔

"واقعی۔"

"ہاں بیٹا۔اور اب میں چاہتی ہوں یہ کام جلدی ہو جائے۔اذعان کے آنے سے پہلے میں بات پکی کرلوں اور پھر اُس کے آتے ہی شادی، ٹھیک ہے نا۔" ماما نے اپنا پروگرام بتا اُن کی تائید چاہی تو وہ ذرا سے کندھے اُچکا کر بولے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ویسے اذعان کیا کہتا ہے۔"

"اُس نے سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔دوپہر میں اُس کا فون آیا تھا تو میں نے بتایا میں اُس کے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں۔ کہنے لگا بس ٹھیک ہے۔اب آگے بھی جو آپ کا دل چاہے کریں اور میرا دل چاہتا ہے فوراً دلہن گھر لے آؤں۔" ماما کی آنکھیں اُس تصور سے چمکنے لگی تھیں۔

"بس تو آپ شادی کی تاریخ فکس کر کے فوراً اذعان کو بلالیں۔" انھوں نے کہا تو ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"بیٹا ابھی تو میں رشتہ لے کر بھی نہیں گئیں۔ پھر وہ اذعان کو دیکھے بغیر ہامی نہیں بھر گے۔"

"یہ تو ہے۔پھر آپ دیر کیوں کر رہی ہیں۔بات تو کریں۔"

"ہاں جلدی جاؤں گی۔دُعا کرو وہ لوگ مان جائیں۔"

"آپ کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا ماما۔وہ یقین سے کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گیارہ

تھے اس لیے ماما نے انھیں مزید رُکنے پر اصرار نہیں کیا۔البتہ دوبارہ جلدی آنے کی تاکید رکی تھی۔"

نتاشہ کے بعد ماما کے ساتھ باتوں میں کافی حد تک اُن کا دھیان بٹ گیا تھا۔لیکن پھر گھر تے ہی ایک دم تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ لاؤنج ہی بیٹھ گئے اور ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر ٹی وی آن کر دیا۔عابدہ پروین غزل سرا تھیں۔

اے درد بتا کچھ تو ہی بتا
اب تک یہ معما حل نہ ہوا
ہم میں ہے دل بیتاب نہاں
یا آپ دل بیتاب ہیں ہم

"میاں آج اتنی دیر کر دی۔کھانا لگا دوں۔" دینو بابا پوچھ رہے تھے۔وہ غزل میں اتنے تھے کہ کوئی جواب ہی نہیں دیا۔تب ہی فون کی بیل بج اُٹھی۔دینو بابا نے جا کر ریسور اُٹھایا۔ کارڈلیس لے کر اُن کے پاس آگئے۔

"میاں! یہ تیسری بار اذعان میاں کا فون آرہا ہے۔"

"ہیں۔" انھوں نے چونک کر دیکھا۔پھر ٹی وی آف کرنے کے ساتھ اُن کے ہاتھ سے رڈلیس لے کر کان سے لگاتے ہوئے بولے۔

"یس شجیع الحسن۔"

"خیر سے گھر آگئے۔" اذعان نے جیسے اُن کی موجودگی پر شکر کیا۔

"کون اذعان۔کیسے ہو۔"

"میں تو ٹھیک ہوں۔تم اپنی سناؤ۔کہاں رہتے ہو۔شام سے فون کر رہا ہوں۔آفس میں ائی کیا وہاں بھی نہیں تھے اور جہاں بھی تھے سچ بتاؤ وہ ساتھ تھی۔" اذعان نے روانی سے لتے ہوئے آخر میں پوچھا۔

"میں ماما کے پاس تھا۔" وہ بہت ضبط سے بولے تھے۔

"پھر تو تمھیں ساری خبریں مل گئی ہوں گی۔" اذعان نے مایوسی سے کہا۔

"ہاں۔ ماما بہت خوش ہیں۔ تم کب آرہے ہو؟"

"آجاؤں گا یار۔ آجاؤں گا۔ یہ بتاؤ تمھارا معاملہ کہاں تک پہنچا۔" اذعان نے تسلی د کر پوچھا۔ وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر بولے۔

"میرا کوئی معاملہ نہیں ہے۔" اُس کے ساتھ ہی انھوں نے سلسلہ منقطع کردیا تھا۔

"تم نے اُس شخص کو ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا روبا۔ وہ تمھارے ساتھ بہت فیئر ہے۔" اُس دل مسلسل احتجاج کرنے کے ساتھ سرزنش بھی کر رہا تھا لیکن ذہن کچھ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"شروع میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ منیب احمد کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ انھوں امی کے ساتھ اتنا ظلم کیا۔ دیکھنے میں کتنے ڈیسنٹ ہیں۔ شجیع الحسن بھی ایسے ہی ہیں۔"

"تم ایک بار انھیں آزما دیکھو۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔"

تمام رات دل و دماغ کی جنگ نے اُسے سونے نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی بیڈ پر کروٹیں بدل اور کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ صبح کے قریب وہ بہت نڈھال سی ہو کر صوفے پر نیم دراز ہوئی تھی شاید نیند کی دیوی کو اُس پر رحم آگیا اور وہ وہیں بے خبر سوگئی تھی۔ پھر معمول کے مطابق اُٹھنا ممکن ہی نہیں تھا کیوں کہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔

جب منیب احمد اور خرم آفس چلے گئے اُس کے بعد بھی وہ کمرے سے نہیں نکلی۔ تب ا کو اچنبھا ہوا تو اُس کے کمرے میں آئی اور اُسے صوفے پر سوتے دیکھ کر پریشان بھی ہوگئی۔

"عروبہ۔ بیٹا یہاں کیوں سوئی ہو۔" اسماء نے قریب آکر اُس کی پیشانی پر ہاتھ ر ہوئے کہا تو وہ نیند میں بڑبڑائی۔

"سب ایک جیسے ہیں۔"

"روبا! اُٹھو بیٹا۔ دیکھو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔" اُس نے کسمسا کر ذرا سی آنکھیں کھو

اور اسماء کو اپنے اُوپر جھکے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا ہے......؟"

"بیٹا یہ کس طرح سو رہی ہو، گردن میں درد ہو جائے گا۔ اُٹھو بیڈ پر لیٹو۔" اسماء نے اُس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُس کا سر اُونچا کیا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو صوفے پر دیکھ کر اُسے یاد آگیا کہ وہ کب اور کس حال میں سوئی تھی۔ تب جھنجھلا کر بولی۔

"کیوں اُٹھا دیا۔"

"آفس نہیں جاؤ گی۔ میں نے تمھارے پاپا سے بات کرلی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے اگر تمھیں شوق ہے تو......"

"میں شوقیہ جاب نہیں کرتی۔" وہ اسماء کی بات کاٹ کر ناراضی سے بولی اور اٹھ کر واش روم چلی گئی۔

ایک تو ذہنی انتشار دوسرے نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے شاور لینے کے بعد بھی طبیعت بوجھل ہی رہی۔ آفس جانے کو دل نہیں چاہا اور چھٹی تو وہ کرسکتی تھی لیکن اس خیال سے کہ کہیں شجیع الحسن یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اُن کی باتوں کا بُرا مان کر گھر بیٹھ گئی ہے وہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ کیوں کہ اُسے اگر اُن کی کوئی بات بُری لگی بھی تھی تب بھی وہ اُن پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جیسے اُس کے نزدیک کسی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اور یہ شاید اُس کے اندر کا چور تھا۔ بہر حال لیٹ ہونے کے باوجود اُس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور بیگ کندھے پر لٹکا کر ریسٹ واچ کلائی پر باندھتے ہوئے کمرے سے نکلی تو آگے لاؤنج میں اسماء کے ساتھ اُس روز والی خاتون کو بیٹھے دیکھ کر اُس کے قدم رُک گئے۔

"اسلام علیکم......" اُس نے اخلاقاً سلام کہا۔

"وعلیکم السلام......" ماما اُسے دیکھ کر مسکرائیں۔

"اچھا امی میں جارہی ہوں۔" وہ فوراً اسماء کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"بیٹا! ناشتا تو کرلو۔"

"بس پہلے ہی لیٹ ہو رہی ہوں۔ خدا حافظ۔" وہ عجلت میں کہتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔ اور وہ خود کو بہت اسٹرونگ سمجھتی تھی۔ اُس کا خیال تھا حالات نے اُسے اُن بریک ایبل بنا دیا ہے لیکن جب اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے شجیع الحسن پر نظر پڑی تو اپنے بارے میں اُس کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ سینے کے اندر ایسا محشر برپا ہوا کہ وہ پریشان ہو گئی۔ اور ایسا تو ہونا ہی تھا کہ شجیع الحسن کوئی عام سے شخص نہیں تھے۔ نہ ہی اُن کے جذبے اتنے بودے تھے جو وہ آرام سے دامن بچا کر بیٹھ رہتی۔ حالانکہ اس وقت وہ مکمل طور پر اپنے کام میں مصروف تھے۔ اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر جانے کیسی تپش تھی جو اُس کا وجود پگھلائے دے رہی تھی۔ بہت کوشش کے بعد بھی وہ خود کو کوئی کام کرنے پر آمادہ نہیں کر سکی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی تھی۔

لمحے چپ چاپ سرک رہے تھے۔ وہ اپنے اندر کی آوازیں سنتی رہی اور جانے کیوں اس وقت ذہن بالکل خاموش تھا۔ رات کی طرح دل کے مقابل کوئی دلیل نہیں دے رہا تھا۔ پتا نہیں دل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے، یا اُس کی سرکشی کی حد دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر انٹرکام کی بزر سے وہ ذرا سا چونکی تھی اور ریسور اُٹھاتے ہوئے اُس کا ذہن یک لخت بیدار ہو گیا۔

"یس سر......"

"او کے سر......" دوسرے پل وہ ریسور رکھ کر شجیع الحسن کے کمرے میں آئی تو وہ اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں، یا پریشان ہیں۔"

"نو سر۔ آئی مین یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور پریشان بھی نہیں ہوں۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی سعی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا......" اُن کی ذرا سی ہنسی میں غیر یقینی تھی جس سے وہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی۔

"سر وہ۔ میں یہ جاب جاری نہیں رکھ سکتی۔" انھوں نے ایک دم سر اُٹھا کر دیکھا۔ تو فوراً کہنے لگی۔

"میں آپ کی وجہ سے جاب نہیں چھوڑ رہی۔"

"پھر......؟"

"بس میری مدر نہیں چاہتیں کہ میں جاب کروں۔ اس لیے میں ریزائن دے رہی ہوں۔ البتہ آپ کی فرم کے اُصول کے مطابق اس مہینے میں پابند ہوں۔" اُس نے اچانک ابھی جاب چھونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک یونہی اُسے دیکھتے رہے۔ پھر گہری سانس کھینچ کر بولے۔

"او کے۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں۔" پھر سامنے سے فائل اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دی جیسے خاموشی سے لے کر وہ اپنی سیٹ پر آ گئی۔ اور کمپیوٹر پر ڈسک سیٹ کرتے ہوئے اپنے اس اچانک فیصلے کو سوچنے لگی۔ خود اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے ایک دم سے جاب چھوڑنے کا کیوں کہہ دیا اور یہ کہ اُس کے بعد وہ کیا کرے گی۔ نئے سرے سے دوسری جاب، یا کچھ بھی نہیں۔

"اُفوہ۔ ابھی تو ایک مہینہ ہے اس کے بعد دیکھا جائے گا۔" آخر اُس نے جھنجھلا کر سر جھٹکا اور توجہ سے کی بورڈ پر اُنگلیاں چلانے لگی۔ جب کہ شجیع الحسن کن اکھیوں سے اُسے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ وہ یقیناً اُن کی وجہ سے جا رہی ہے اور کیا ستم ظریفی ہے کہ وہ اُسے رُوک بھی نہیں سکتے۔

"آج بیگم شیرازی آئی تھیں۔" اسماء رات میں فراغت سے منیب احمد کے پاس بیٹھ کر بتانے لگی۔ "آپ شاید ملے ہیں اُن سے اِسی لائن میں کارنر کا بنگلہ ہے۔ عروبہ کے لیے اپنے بیٹے کا پرپوزل دے گئی ہیں۔"

"اچھا۔ کیا کرتا ہے اُن کا بیٹا؟" منیب احمد اسماء کی آخری بات پر پوری طرح متوجہ ہوئے تھے۔

"بزنس کرتا ہے۔"

"کیا نام ہے؟" اسماء کو ذہن پر زور دینے کے بعد یاد آیا تھا۔

"ہاں اذعان۔ اذعان شیرازی۔ آپ جانتے ہیں۔"

"ہوں......" اس بار منیب احمد سوچ میں پڑ گئے۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولے۔ "جانتا تو نہیں لیکن نام سنا ہوا لگ رہا ہے۔ خیر تم بتاؤ، تم نے کیا کہا۔"

"یہی کہ آپ سے بات کروں گی۔ پھر جیسا آپ مناسب سمجھیں گے۔" اسماء نے کہا تو قدرے توقف سے وہ پوچھنے لگے۔

"اکیلی آئی تھیں، یا بیٹا بھی ساتھ تھا۔"

"اکیلی تھیں اور بیٹے کا بتا رہی تھیں جرمنی گیا ہوا ہے بزنس کے سلسلے میں۔"

"آئے گا کب؟"

"شاید اگلے ہفتے۔"

"ٹھیک ہے اُس سے ملنے کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا۔ اور دیکھو تم عروبہ کو سمجھاؤ کہ وہ پچھلی باتیں بھول جائے اسی میں اُس کی بہتری ہے۔" منیب احمد نے کہا۔ اسماء خاموش ہو رہی۔ پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔

"ویسے آپا نے بھی اپنے بیٹے شہریار کے لیے کہا ہوا ہے۔ لڑکا وہ بھی اچھا ہے۔"

"پہلے میں اُسے تو دیکھ لوں۔" منیب احمد فوراً بولے تھے اس لیے اسماء نے شہریار کے بارے میں مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور لائٹ آف کرنے کے بہانے اُٹھ گئی۔

پھر دو دن گزرے تھے کہ ماما پھر آ گئیں۔ اور اس بار وہ شام میں آئی تھیں جب منیب احمد بھی موجود تھے۔ گو کہ وہ بھی ماما کی شخصیت سے خاصے متاثر تھے لیکن صرف انھیں دیکھ کر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اُن سے بھی انھوں نے یہی کہا کہ وہ اذعان سے ملنے کے بعد جواب دیں گے، اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ ماما اُن سے اتفاق کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"آپ کو پورا حق ہے میرے بیٹے کے بارے میں مکمل چھان بین کر لیں۔ میں اپنے منہ سے اُس کی تعریف نہیں کروں گی، لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ انشاء اللہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔

آپ نے اپنی بیٹی کے لیے جیسا سوچا ہوگا اُس سے بڑھ کر پائیں گے اور ہاں ایک درخواست کروں گی آپ سے کہ جب فیصلہ کر لیں تو پھر شادی میں دیر نہیں کیجیے گا کیوں کہ تنہائی اب میرے لیے عذاب ہو گئی ہے۔"

"اور، بچے نہیں ہیں آپ کے؟" منیب احمد نے پوچھا۔

"نہیں۔ بس ایک ہی بیٹا ہے میری کل کائنات۔ اور اللہ چاہے گا تو ایک ہی بیٹے سے میرے گھر میں بہت رونقیں اُتریں گی۔" ماما کے لہجے میں اپنے بیٹے کے لیے بڑے ارمان تھے۔ پھر وہ یہ کہہ کر رخصت ہوئیں کہ جس روز اذعان آئے گا وہ اُسی روز منیب احمد اور اسماء کو اپنے گھر مدعو کریں گی۔ اور یہ اتفاق تھا کہ جس وقت ماما جا رہی تھیں اُسی وقت عروبہ آفس سے آ رہی تھی۔ اُس نے ماما کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا اور اتنی جلدی اُس خاتون کی دوبارہ آمد پر وہ کچھ ٹھٹھکی تھی لیکن اسماء کے ساتھ کیوں کہ منیب احمد بھی موجود تھے اس لیے وہ فوراً کچھ پوچھ نہیں سکی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"میرا خیال ہے عروبہ کو جاب چھوڑ دینی چاہیے۔" منیب احمد نے اُس کے پیچھے دیکھتے ہوئے اسماء سے کہا۔

"میں نے کہا تھا اُس سے لیکن وہ نہیں مانتی۔" اسماء سادگی سے بولی تھی۔

"بہت غلط تربیت کی ہے تم نے اُس کی۔" منیب احمد نے فوراً الزام اُس کے سر رکھ دیا تو وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ تب ہی خرم آ گیا اور اُس سے پہلے کہ وہ ماں کے چہرے پر اُترے کسی دکھ کو محسوس کرتا منیب احمد اُسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہنے لگے۔

"کیا بات ہے، بہت مصروف رہنے لگے ہو آج کل۔ کیا ابھی تک آفس میں تھے؟"

"جی۔ عروبہ کہاں ہے......؟" خرم نے مختصر جواب کے ساتھ پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔ وہ بھی ابھی آفس سے آئی ہے۔" منیب احمد نے عروبہ کا آفس جانا جتایا تو اسماء چائے کے بہانے وہاں سے اُٹھ گئی، کیوں کہ اب وہ مزید کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے چائے بننے تک قصداً خود کو اِدھر اُدھر مصروف رکھا اور جب ملازم نے چائے کی

ٹرے لے جا کر رکھ دی تب خرم کے پکارنے پر اُسے مجبوراً آنا پڑا تھا۔

منیب احمد خرم کو ماما کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اور اُن کی آمد کا مقصد بتا کر کہنے لگے۔

"اذعان شیرازی نام ہے لڑکے کا، امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ آج کل جرمنی گیا ہوا ہے اور میں چاہتا ہوں اُس کی آمد سے پہلے تم اُس کے بارے میں کچھ چھان بین کرلو، ویسے اُس کی ماں تو بہت اچھی سلجھی ہوئی خاتون ہے پھر بھی ہمیں لڑکے کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہیے۔"

"فکر نہیں کریں۔ میں کل ہی معلوم کرلوں گا۔" خرم نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"اور بیٹا تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ وہ شبنم......" منیب احمد نے اسی قدر کہا تھا کہ خرم بول پڑا۔

"نہیں پاپا وہ بات ختم ہوگئی۔ اب تو ممی ہی میرے لیے سوچیں گی اور عروبہ کی شادی کے بعد، کیوں ممی ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں لیکن روبا کی شادی کے بعد کیوں۔ اگر دونوں کی ساتھ ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔" اسماء نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں۔ میں دو شادیاں ایک ساتھ کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔" منیب احمد نے جانے کس بنا پر اختلاف کیا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اسماء صلح جو انداز میں بولی تھی۔

ماما بڑی شدت سے اذعان کی منتظر تھیں تا کہ اُس کے آتے ہی شادی کا سلسلہ شروع ہو اور وہ اُس کی دلہن لے کر آئیں۔ غالباً اُن کے اندر خدشہ تھا کہ زیادہ دن گزرنے پر کہیں اذعان اپنا ارادہ بدل نہ دے۔ پہلے ہی اتنی مشکل سے آمادہ ہوا تھا۔ اور اُس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ جس طرح پہلے انھیں چکر دیتا رہا تھا۔ اب بھی اپنی بات سے پھر سکتا تھا۔ اور اِسی خدشے کے تحت وہ چاہتی تھی کہ اُس کا ارادہ بدلنے سے پہلے ہی وہ اُس کے سر پر سہرا سجا دیں۔ پھر انھیں

عروبہ بھی بہت پسند آئی تھی اور وہ کسی صورت اُسے کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ اس وقت اذعان کا فون آیا تو وہ چھوٹتے ہی بولیں۔

"بس بیٹا تم پہلی فلائیٹ سے واپس آجاؤ۔"

"کیوں ماما۔ خیریت تو ہے نا۔" اذعان کو اُن کی فکر لاحق ہوئی۔ "آپ کی طبیعت......"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تم نہیں آئے تو پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" وہ الجھا تھا۔

"بس تم آجاؤ۔ میں تنہائی سے عاجز آگئی ہوں اور بیٹا تمھیں ذرا احساس نہیں ہے۔ دس دن کا کہہ کر گئے تھے اور اب کتنے دن ہوگئے ہیں۔" ماما نے اُسے لتاڑنا شروع کیا، تو ادھر سے وہ بھی جھنجلا کر بولا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں میں یہاں کوئی تفریح نہیں کر رہا۔ کام سے آیا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں اتنا کام پھیلانے کی۔ جو یہاں ہے وہ بھی اللہ کا شکر ہے۔ بہت زیادہ ہے۔ صرف تمھارے لیے ہی نہیں تمھارے بچوں کے لیے بھی۔"

"یہ بچے کہاں سے آگئے۔" اس بار اذعان نے کچھ معاملہ سمجھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"آئے نہیں آجائیں گے۔ سمجھے تم اور یہ بھی سمجھ لو کہ اگر تم پہلی فلائیٹ سے نہیں آئے تو......" ماما نے وارننگ اُدھوری چھوڑ کر فون بند کر دیا کیوں کہ جانتی تھیں کہ زیادہ تفصیل سے بات کرنے پر اذعان اپنی منوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ جب کہ ایسی صورت میں بھاگا چلا آئے گا۔ اور یہی ہوا۔ اگلے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ ابھی فیکٹری کے منیجر کو فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ اذعان آگیا۔ چند دنوں کی تبدیلی آب و ہوا ہمیشہ اس پر بہت اچھا اثر ڈالتی تھی۔

"لیجیے ماما آپ کے حکم پر پہلی فلائیٹ سے آگیا۔" وہ ماما کے گلے لگتے ہوئے بولا، جواب میں ماما نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔" اللہ تمھارے جیسی نیک سعادت مند اولاد سب کو دے۔"

"ہاہاہا......" حسب عادت اُس نے زوردار قہقہہ لگایا پھر ماما کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ بتایئے اصل معاملہ کیا ہے۔ اتنے شارٹ نوٹس پر بلانے کی وجہ......؟"

"میں تمھارے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں۔" ماما نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"او ماما یہ تو آپ مجھے گزشتہ ہفتے فون پر بتا چکی ہیں۔"

"لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ میں تمھارا پرپوزل لے کر بھی گئی تھی۔"

"تو کیا انھوں نے منع کر دیا۔" وہ پھر فوراً بولا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔ منع کیوں کریں گے۔ تم فضول باتیں مت کیا کرو۔" ماما قدرے خفگی سے اُسے ٹوکنے کے بعد کہنے لگیں۔ "وہ تم سے ملنے کے بعد کوئی جواب دیں گے۔ اِس لیے میں نے تمھیں بلایا ہے اور ابھی میں فون کر کے انھیں آج رات کے کھانے پر انوائیٹ کر لیتی ہوں تم کہیں جانا نہیں۔ سمجھے۔"

"او گاڈ۔" اُس نے گہری سانس کھینچ کر دونوں ٹانگیں سامنے ٹیبل پر سیدھی کیں پھر کہنے لگا۔ "یہ کام ایک ہفتے بعد بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کے لیے ایمرجنسی میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ پتا ہے میں ایک دو دن میں کتنے ضروری کنٹریکٹ سائن کرنے والا تھا۔"

"وہ تم یہاں سے بھی کر سکتے ہو۔" ماما بے نیازی سے کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں منیب صاحب کے ہاں فون کر لوں اور ہاں تم ناشتا کرو گے؟"

"نہیں۔ میں سونے جا رہا ہوں۔" وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماما فون کرنے کے بعد اُسی وقت خانساماں کو ہدایت دینے لگیں۔ اُس سے فارغ ہوئیں تو اپنی نگرانی میں صفائی کروانے کھڑی ہو گئیں۔ یوں شام تک وہ مسلسل کچھ نہ کچھ کرتی رہی تھیں۔ جس سے اذعان کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اپنی ماں کو کتنی بڑی خوشی سے محروم رکھے ہوئے تھا۔ اگر وہ اُن کی خاطر پہلے ہی مان لیتا تو وہ اتنی اکیلی نہ ہوتیں۔ کتنی قربانیاں دی ہیں انھوں نے اُس کے لیے اور وہ ایک خوشی کے لیے انھیں ترساتا رہا ہے۔ دیر سے ہی سہی بہرحال اُسے ماں کی خوشی کا احساس

ہوا تھا۔ جب منیب احمد، اسماء اور خرم کے ساتھ آئے تو اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو انھیں گراں، یا ناگوار گزرتی ورنہ پہلے کئی بار وہ دانستہ ایسی حرکتیں کر چکا تھا۔ بہرحال کھانے سے پہلے ہی منیب احمد نے باتوں باتوں میں اُس کا اچھا خاصا انٹرویو کر ڈالا اور نہ صرف مطمئن ہوئے بلکہ خوش بھی تھے۔ وقتِ رُخصت جب ماما نے اُن سے پوچھا کہ وہ پھر کب اُن کے گھر آئیں گے تو جواب میں انھوں نے کہا تھا۔

"جب چاہیں تشریف لے آئیں۔ عروبہ ہمارے پاس آپ کی امانت ہے۔" اس جواب پر ماما جتنی خوشی ہوئیں اسماء اسی قدر خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔

"تو بھائی صاحب ایسے کیسے جا رہے ہیں منہ میٹھا کر کے جائیں۔" ماما نے کنکتی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر ملازم کو پکارا تو اسماء جیسے ہوش میں آ کر بولی تھی۔

"ابھی رہنے دیں۔ پھر آئیں گے تو منہ میٹھا کر لیں گے۔"

"جی آنٹی۔ ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" خرم ماں کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھکا تھا جب ہی فوراً اُس کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے یہ رسم میں تمھارے گھر آ کر کر لوں گی۔" ماما جہاں دیدہ خاتون تھیں اس لیے زیادہ اصرار نہیں کیا البتہ سوچ میں ضرور پڑ گئیں تھیں۔

"تمھیں اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے......؟" گھر آتے ہی منیب احمد نے اسماء سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن آپ نے ہامی بھرنے میں جلدی کی ہے۔ میرا مطلب ہے پہلے ہمیں عروبہ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ اگر اُس نے منع کر دیا تو۔" اسماء کسی طرح اپنے خدشے کو دبا نہیں سکی۔

"کیوں۔ کیوں منع کرے گی۔ وہ کیا کمی ہے لڑکے میں۔ بلکہ ایسا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔" منیب احمد نے ایک طرح سے اسماء کے میکے کی حیثیت کو جتایا تھا۔

"اب پتا نہیں کیا سوچا ہے اُس نے۔" اسماء اپنے آپ سے بولی تھی۔ آواز بہت دھیمی تھی پھر بھی منیب احمد سن کر بولے۔

"کچھ بھی سوچا ہو۔ اب اُس کی شادی یہیں ہوگی۔ تم بتا دو اُسے کہ میں نے اُس کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

ٹھیک ہے میں بتا دیتی ہوں لیکن میں اُسے مجبور نہیں کروں گی۔" اسماء اپنی بات کہہ کر رُکی نہیں۔ اُسی وقت عروبہ کے کمرے میں آگئی۔

عروبہ پنجرہ ہاتھ میں لیے دھیمی آواز میں طوطے سے جانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ اسماء کو اس پر پیار کے ساتھ رحم بھی آیا کہ یہاں آ کر اُس کی بیٹی کتنی اکیلی ہوگئی تھی۔

"تم نے خود کو اتنا پابند کیوں کر لیا ہے بیٹا۔" اسماء اُس کے پاس بیٹھ گئی اور آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ عروبہ گردن موڑ کر اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کی نظروں میں جانے کیا تھا کہ اسماء کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"ہٹاؤ اسے۔ یہ تمھاری باتیں کہاں سمجھتا ہوگا۔ جو کہنا ہے مجھ سے کہو۔" اسماء نے پنجرے کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ تو اُس سے بھی زیادہ مجبور ہیں۔ سمجھ کر بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔" وہ صاف گوئی سے کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور پنجرہ کھڑکی میں لٹکا کر واپس پلٹی تو اسماء دکھ سے بولی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ میں سمجھ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی۔"

"اس میں قصور کسی اور کا نہیں آپ کا اپنا ہے۔ خود کو اتنا مجبور اور بے بس سمجھ لیا آپ نے۔ اپنے آپ پر تو بھروسا تھا ہی نہیں آپ کو۔ کم از کم مجھ پر ہی کیا ہوتا۔ پھر دیکھتیں میں کیسے آپ کو آپ کا اصل مقام دلاتی۔ اب تو آپ محض کھلونا بن کر رہ گئیں ہیں۔ منیب احمد ایک طلاق کی دھمکی دے کر جو چاہتے ہیں آپ سے منوا لیتے ہیں۔" اُس کے اندر جانے کب سے غبار بھرا ہوا تھا ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ اسماء نے انتہائی بے بسی سے سر جھکا لیا تو وہ ہونٹ بھینچ کر کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی پھر اُس کے پاس آ بیٹھی اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"اب کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ منیب احمد اب کیا منوانا چاہتے ہیں۔" اسماء نے چونک کر سر اُونچا کیا تو وہ زہر خند سے بولی۔

"میں نادان نہیں ہوں امی۔ آپ کی بے بسی مجھے سب سمجھا دیتی ہے۔ بتایئے کیا بات ہے؟"

"وہ......" اسماء اپنے آپ میں اُلجھنے لگی۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ بتا دیجیے۔" اُس نے اصرار کیا۔

"تمھارے پاپا نے تمھاری بات طے کر دی ہے۔" اسماء ایک دم کہہ گئی، اور وہ اُچھل پڑی۔

"کیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر۔ انھیں یہ حق کس نے دیا۔"

"وہ تمھارے باپ ہیں۔" اسماء نے تنبیہہ کی۔

"ہونہہ باپ۔" وہ تنفر سے سر جھٹکتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ساری زندگی کیا دیا باپ نے جو اب اپنا حق جتانے آ گئے ہیں۔ صاف کہہ دیجیے اُن سے کہ مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔

"لیکن بیٹا وہ ہامی بھر چکے ہیں۔" اسماء نے بڑی عاجزی سے اُسے دیکھا لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

"یہ اُن کا مسئلہ ہے۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ یا انھوں نے پھر طلاق کی دھمکی دی ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" اسماء نے زچ ہو کر ٹوک دیا۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمھیں مجبور نہیں کروں گی لیکن سوچنے کو ضرور کہوں گی۔ محض ضد میں ایک اچھے پرپوزل کو ریجکٹ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر چاہو تو لڑکے کو دیکھ اور مل بھی سکتی ہو۔"

"کیا کروں گی دیکھ کر اور مل کر جب مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی تھی۔

"ابھی نہیں تو دو چار سال بعد۔ ساری زندگی تو......"

"ہاں ساری زندگی ایسے ہی رہوں گی۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "اور آپ، بے فکر رہیں بوجھ

نہیں بنوں گی کسی پر۔ کہہ دیجیے منیب احمد سے کہ انھوں نے اگر اس سلسلے میں آپ کو ٹارچر کیا تو میں یہ گھر بھی چھوڑ جاؤں گی۔'' اسماء قدرے سناٹے میں آ گئی تھی۔ کتنی دیر اُس پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ پھر مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل کر آئی اور لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔ منیب احمد اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور وہ فوری طور پر اُن کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیوں کہ جانتی تھی کہ وہ چھوٹتے ہی اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیں گے جن کا جواب دینے کے لیے بہت ہمت کی ضرورت تھی۔ اور وہ ایسی ہمت اور جرأت کہاں سے لاتی۔ ایک طرف شوہر دوسری طرف بیٹی تھی۔ ایک طلاق کی دھمکی دیتا تھا اور دوسری اب گھر چھوڑنے کی دھمکی دے گئی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کس جرم کی سزا کاٹ رہی ہے۔ کتنی دیر ہو گئی تھی اُسے وہاں بیٹھے ہوئے۔ جب کافی حد تک اُس کے اعصاب پُرسکون ہو گئے تب اُس نے اپنے کمرے میں جانے کا سوچا تھا کہ خرم جانے کس کام سے اپنے کمرے سے نکل کر آیا اور اُسے لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر پہلے ٹھٹکا پھر قریب آ کر پوچھنے لگا۔

''کیا بات ہے ممی آپ سوئی نہیں ابھی تک۔'' اُس کے سینے سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی۔ پھر خرم کو دیکھ کر بولی۔

''نیند نہیں آ رہی۔''

''پاپا سو گئے۔''

''ہاں شاید۔ تم کیوں جاگ رہے ہو؟'' اُس نے مبہم سا جواب دے کر پوچھا۔

''میں کام کر رہا تھا۔'' خرم سرسری انداز میں بتا کر اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ ''مجھ سے کیوں چھپاتی ہیں ممی۔ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔''

''کیا۔ کیا چھپایا ہے میں نے تم سے۔'' وہ اندر سے پریشان ہو گئی تھی۔

''اگر نہیں چھپایا تو اب بھی نہیں چھپائیں۔ مجھے بتائیں کہ کیا بات آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ اب پلیز یہ مت کہہ دیجیے گا کہ کوئی بات نہیں۔ میں نے شام میں شیرازی صاحب کے گھر میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ آپ ایک دم خاموش ہو گئی تھیں اور پریشان بھی۔ آپ کو اذعان پسند

نہیں آیا، یا آپ نے عروبہ کے لیے کچھ اور سوچا ہوا تھا؟'' خرم نے بڑی خوب صورتی سے اُسے گھیر لیا تھا۔ پھر بھی وہ ٹال گئیں۔

''یہ دونوں باتیں نہیں ہیں بیٹا۔''

''پھر کیا بات ہے......؟''

''تمھارے پاپا کی جلد بازی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ بے شک اذعان اچھا لڑکا ہے پھر بھی انھیں پہلے عروبہ سے پوچھنا چاہیے تھا۔''

''تو کیا عروبہ منع کر رہی ہے؟'' خرم نے فوراً پوچھا۔ لیکن اُس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔

''عروبہ کہتی ہے اُسے شادی کرنی ہی نہیں ہے اور کم از کم میں تو اُسے قائل نہیں کر سکتی۔ ادھر تمھارے پاپا زبان دے چکے ہیں۔ اب بتاؤ میں پریشان ہوں کہ نہیں۔''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' خرم نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

''تم نہیں جانتے بیٹا ان باپ بیٹی کو۔ دونوں اپنی ضد کے پکے ہیں۔'' اسماء کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی۔

''ہوا کریں۔ آپ کو بہرحال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بات کروں گا عروبہ سے۔ وہ اگر مان گئی تو ٹھیک۔ دوسری صورت میں اذعان کی ماما کو صاف جواب دے آؤں گا۔''

''نہیں بیٹا۔ تمھارے پاپا بہت ناراض ہوں گے۔'' اسماء خائف ہو کر بولی تھی۔

''میں نہیں کروں گا اُن کی ناراضگی۔ آپ پر کوئی بات نہیں آئے گی۔ آپ بس اطمینان سے سو جائیں۔'' خرم نے اُسے اپنائیت کا احساس اور مان دیا تو اُس کی پیشانی چومتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''میں اتنی مجبور بھی نہیں ہوں جتنا منیب احمد نے مجھے سمجھ لیا ہے۔''

اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ کسی بات کو خود پر طاری نہیں کرے گی اس لیے رات اسماء کی باتوں کو اُس نے بس کچھ دیر ہی سوچا تھا اُس کے بعد سر جھٹک کر سوگئی تھی۔ جب ہی معمول کے مطابق اُٹھ بھی گئی اور خلاف معمول منہ ہاتھ دھوکر کمرے سے نکل آئی ورنہ منیب احمد اور خرم آفس جانے کے بعد ہی نکلتی تھی۔ اور اب اس خیال سے آئی تھی کہ اگر اُس کے سامنے اُس کی شادی کا ذکر چھیڑا گیا تو وہ خود منیب احمد سے کہہ دے گی کہ انھیں اُس کے بارے میں سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اتفاق سے چھٹی کا دن تھا اور ابھی تک کوئی ناشتے کی ٹیبل پر نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر اپنے لیے ایک کپ چائے لے کر لان میں نکل آئی۔ صبح کے آغاز پر ہر شے نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اُس نے ٹہلنے کے انداز میں لان کے دو تین چکر لگائے پھر آرام سے لان چیئر پر بیٹھ گئی اور اپنے آئندہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ کہ شجیع الحسن کا آفس چھوڑنے کے بعد اُسے کیا کرنا ہے۔ ابھی تک اُس نے کسی اور جگہ اپلائی نہیں کیا تھا۔ جب کہ پندرہ دنوں میں یہاں سے فارغ ہونے والی تھی۔ اُس کے بعد وہ بالکل گھر کی ہوکر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک دن چھٹی کا ہی مشکل سے گزرتا تھا۔

''مجھے ابھی سے کوشش کرنی چاہیے۔'' وہ سوچتے ہوئے اُٹھی اور لاؤنج سے اخبار لے کر اپنے کمرے میں آگئی، دوسری خبروں سے اُسے کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے ویکنسز والا پیج نکال کر سامنے پھیلا لیا اور پوری توجہ سے ایک ایک ایڈ دیکھ رہی تھی کہ دستک کے ساتھ دروازہ کھول کر خرم اندر آتے ہوئے بولا۔

''صبح بخیر۔'' اُس نے بلا ارادہ سر اُونچا کر کے خرم کو دیکھا اور دوبارہ اخبار پر جھک گئیں۔

''کوئی خاص خبر ہے کیا......؟'' خرم اُس کے سامنے آبیٹھا۔ وہ کچھ نہیں بولی بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔

''اچھا اچھا ضرورت رشتہ کے اشتہار دیکھ رہی ہو۔ مگر کس کے لیے۔ تمھارا رشتہ تو سنا ہے طے ہو چکا ہے۔'' خرم نے بظاہر چھیڑنے کے انداز میں کہا لیکن وہ بڑے آرام سے بولی۔

''میں نے بھی سنا ہے۔''

''اُس کا مطلب ہے یہ بات سچ ہے۔'' خرم بغور اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''اُس سے بڑا سچ یہ ہے کہ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔'' وہ اتنے سکون سے جواب دے رہی تھی کہ خرم کو حیرت ہوئی۔

''کہاں......؟''

''وہاں جہاں برف گرتی ہے۔'' اُس نے خوب صورتی سے بات بنائی۔

''یعنی مری......؟''

''برف صرف مری میں تو نہیں گرتی۔ ویسے آپ کو اُس سے کیا میں کہیں بھی جاؤں۔'' وہ اخبار رول کرتے ہوئے بولی۔

''اور میں تو جیسے تمھیں جانے دوں گا۔ خبردار کہیں جانے کی بات مت کرنا۔'' خرم نے ایک دم سنجیدہ ہوکر ٹوکا تو وہ بھی پیشانی پر بل ڈال کر بولی۔

''آپ مجھے نہیں روک سکتے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں کیا نہیں اس بات کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔'' خرم اصل موضوع کی طرف آگیا۔

''میری مرضی۔'' وہ حد درجہ نروٹھی تھی۔

''اچھی بات ہے......'' خرم کو شاید اندازہ ہوگیا کہ اس وقت ایسے ہی جواب ملیں گے اس لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگا۔ ''سنو ناشتا نہیں کروگی؟

''ابھی نہیں۔'' وہ کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہوگئی اور خرم کے جانے کے بعد اطمینان کا سانس لیتی اُٹھ کر پنجرے کے پاس آگئی اور ذرا سا پنجرہ ہلایا تھا کہ طوطا چلانے لگا۔

''روبا۔ روبا۔''

''تمھاری روبا کے خلاف پھر سازش ہو رہی ہے لیکن میں اب کمزور نہیں پڑوں گی۔ ویسے میرا خیال ہے خرم بھائی سمجھ گئے ہیں اور دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑیں گے۔ اور امی کو بھی سمجھا دیں گے۔ ہیں نا۔''

''روبا۔ روبا۔''

"یار! ایک تو تم بھی بس ایسے ہی ہو۔" وہ سر جھٹک کر اُس کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھر سارا دن وہ لاشعوری طور پر انتظار کرتی رہی کہ منیب احمد کے کہنے پر اسماء پھر اُس سے بات کرنے آئے گی اور خود کو بے بس ظاہر کر کے اُسے قائل کرنے کی کوشش کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا جس سے وہ کچھ اطمینان سے ہو گئی تھی۔ اور شام میں اپنے کمرے سے نکلی تو لاؤنج میں اسماء کے ساتھ منیب احمد کو بیٹھے دیکھ کر وہ رُکے بغیر کچن میں چلی آئی۔ گو کہ خانساماں موجود تھا پھر بھی وہ اپنے کام خود ہی کرتی تھی۔ چائے، کھانا گرم کرنا اور طوطے کے لیے چوری وغیرہ۔

خانساماں اُسے دیکھتے ہی ایک طرف ہٹ گیا۔ اُس نے کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھا اور ابھی ماچس اُٹھائی تھی کہ خرم اُسے پکارتا ہوا آ گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟"

"چائے۔ آپ پئیں گے۔" اُس نے سیدھے سادے انداز میں پوچھا۔

"نہیں اور تمھیں بھی اس وقت چائے پینے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو میں تمھیں آئس کریم کھلاؤں گا۔" خرم نے آگے آ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں۔ مجھے آئس کریم پسند نہیں ہے۔" اُس نے منع کیا۔

"ارے جو آئس کریم میں کھلاؤں گا اُس کے بعد تمھیں اور کوئی چیز اچھی لگے گی ہی نہیں۔" خرم زبردستی اُسے کچن سے نکال لایا اور وہیں سے پکار کر بولا۔

"ممی میں روبا کو آؤٹنگ پر لے جا رہا ہوں۔ ہماری واپسی دیر سے ہو گی۔ کھانے پر انتظار نہیں کیجیے گا۔"

"اُف! مجھے چینج تو کرنے دیں۔" اُس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔

"بس ٹھیک ہو۔" خرم اُس کے آمادگی ظاہر کرنے کے باوجود اُسے کھینچتا ہوا گاڑی تک لایا تھا۔ پھر جب مین روڈ پر آیا تب پوچھنے لگا۔

"کہاں چلو گی......؟"

"مجھے کیا پتا۔ میں نے تو پروگرام نہیں بنایا۔"

"پروگرام بنتے کیا دیر لگتی ہے۔ میں دو منٹوں میں بنا سکتا ہوں۔ پہلے آئس کریم پھر میں تمھیں شاپنگ کراؤں گا۔ اس کے بعد چائنیز چلیں گے۔ ٹھیک۔" خرم نے اُس کی تائید چاہی۔

"اتنی مہربانی کس سلسلے میں؟" وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تم میری اکلوتی بہن ہو۔ تمھیں تو مجھ سے فرمائش کرنی چاہیے۔"

"اچھا......" وہ یونہی ہنس پڑی۔

"اور کیا۔ جب تک میری بیوی نہیں آ جاتی تم مجھ سے ہر قسم کی فرمائش کر سکتی ہو۔" خرم اُس کے ہنسنے پر موڈ میں آ گیا تھا۔

"اور بیوی آنے کے بعد۔" وہ محظوظ انداز میں اُسے دیکھنے لگی تھی۔

"تب بھی کرنا لیکن اُس کے سامنے نہیں۔ ہو سکتا ہے اُسے بُرا لگے۔"

"لگا کرے۔ میں تو اُس کے سامنے بھی کروں گی۔" وہ گردن اکڑا کر بولی۔

"یہ کی نا تم نے بہنوں والی بات۔ اس خوشی میں ڈبل آئس کریم۔ پھر ایک جگہ گاڑی پارک کر کے بولا۔ "میرا خیال ہے اندر چلتے ہیں۔ چلو۔"

اُس نے پہلے ہاتھوں سے بال ٹھیک کیے پھر اُتر گئی۔ اور اندر آتے ہی وہ کچھ گم صم ہو گئی تھی یہ وہی جگہ تھی جہاں کچھ روز پہلے ایک شخص نے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے ساتھ اُسے پرپوز کیا تھا۔ محبتوں سے چور لہجہ یک لخت اُس کی سماعتوں پہ دستک دینے لگا تھا۔

"مجھے آپ سے محبت ہے اور بلاشبہ میری زندگی میں آنے والی آپ پہلی لڑکی ہیں جسے میں نے اپنی تنہائیوں میں سوچا ہے۔ مجھے غلط نہیں سمجھیے گا۔ میں نے زندگی کے کسی معاملے میں کبھی بے ایمانی نہیں کی۔ ابھی بھی پوری ایمان داری سے آپ کو پرپوز کر رہا ہوں۔"

"کیا بات ہے سسٹر۔" خرم نے اُس کے سامنے ٹیبل پر انگلی بجا کر اُسے متوجہ کیا تو وہ بُری طرح چونکی اور ابھی سنبھلی بھی نہیں تھی کہ خرم کے پیچھے دوسری ٹیبل پر نظروں کے عین سامنے شجیع الحسن کو بیٹھے دیکھ کر اُس کا پورا وجود سن ہو گیا کیوں کہ وہ بڑی شاکی نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"روبا۔ یہ اچانک کیا ہوا ہے تمہیں۔" خرم نے مزید اُس کی طرف جھک کر ٹوکا تو اُس نے بہت کوشش سے شجیع الحسن کی طرف سے دھیان ہٹا کر خرم کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر آہستہ سے بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"اچھا کون سا فلیور لوگی۔ چاکلیٹ یا......"

"چاکلیٹ۔" وہ فوراً کہہ کر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں جانے کیسی چبھن اُتر آئی تھی حالانکہ اُس نے کوئی خواب نہیں سجائے تھے پھر بھی دل کو سمجھانا مشکل ہو رہا تھا۔ آئس کریم آنے پر جب خرم نے اُسے متوجہ کیا تب اُس نے ڈرتے ڈرتے پہلے اُس کے پیچھے دیکھا اور شجیع الحسن کو موجود نہ پا کر اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"کیا واقعی تمہیں آئس کریم پسند نہیں ہے؟" خرم جانے کیا سمجھا تھا۔

"بُری بھی نہیں لگتی۔" وہ اپنے کپ پر جھک گئی اور ایک چمچ حلق سے نیچے اُتارنے کے بعد خرم کو دیکھ کر کہنے لگی۔

"اصل میں میں آپ کی بات کو سوچ رہی تھی۔ آپ نے کہا میری بیوی کے سامنے فرمائش نہیں کرنا۔ اُس کا مطلب ہے آپ نے لڑکی پسند کر لی ہے۔"

"او۔ تم نے اپنے آپ مطلب نکال لیا اور بالکل غلط۔ خرم نے حیرت کے اظہار کے ساتھ کہا لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

"کوئی غلط نہیں۔ بتائیں کون ہے۔"

"ہے نہیں۔ تھی۔" خرم بے نیازی سے بولا تھا۔

"تھی۔ یعنی اُس کی شادی ہوگئی۔" اُس نے فوراً قیاس کر لیا۔

"نہیں۔ بلکہ میں نے اُس سے شادی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں......؟"

"اُس کا جواب بعد میں دوں گا۔ پہلے تم بتاؤ تم شادی سے کیوں منع کر رہی ہو۔" خرم نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔ وہ بھی بے نیازی سے بولی۔

"مجھے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کیوں۔ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ مجھے اپنی ماں جیسی زندگی نہیں گزارنی۔"

"بے وقوف۔ ضروری تو نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ حالات نے تمہیں بہت کچھ سکھایا ہوگا۔ اس حساب سے تم اپنی زندگی میں بہت کامیاب ہو سکتی ہو۔" خرم نے نرمی سے پوچھتے ہوئے کہا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ تمہارے اندر پاپا کے خلاف رنجش ہے۔ جس نے تمہیں ہر شخص سے متنفر کر دیا ہے۔ اور اُس سے نقصان صرف تمہارا ہوگا۔ سمجھی تم۔" وہ خاموشی سے دیکھتی رہی بولی کچھ نہیں۔ تو قدرے توقف سے خرم پھر گویا ہوا۔

"ابھی تم کم عمر ہو۔ جذباتی ہو کر سوچتی ہو اور سمجھتی ہو کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر ساری زندگی بغیر کسی سہارے کے گزار لوگی۔"

"ہاں گزار لوں گی۔" وہ روٹھے لہجے میں بولی تھی۔

"یہ تمہاری بھول ہے۔ دو قدم نہیں چل سکتیں۔ میں تمہیں چیلنج نہیں کر رہا نہ ہی مجبور۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ پاپا کی نفرت سے ہٹ کر سوچو۔ تب تمہیں معلوم ہوگا کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے تو اس زمین پر کوئی گھر نہ ہوتا۔"

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں پھر بھی میں شادی کی ہامی نہیں بھروں گی۔" اُس نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"ممی کی خاطر بھی نہیں۔" خرم بے اختیار بولا تھا۔

"او......" اُس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر تاسف سے کہنے لگی۔ "سارا مسئلہ ممی کا ہے جو بے چاری منیب احمد کے سامنے اتنی مجبور ہیں کہ......

"نہیں۔ ممی مجبور نہیں ہیں۔" خرم نے فوراً ٹوک دیا۔

''بس کریں خرم بھائی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ منیب احمد امی کو طلاق کی دھمکی دے کر اپنی ہر بات منوا لیتے ہیں۔ ابھی بھی انھوں نے یہی کیا ہوگا کہ اگر میں نے اس رشتے سے انکار کیا تو وہ انھیں طلاق دے دیں گے۔'' وہ یک دم غصے میں آگئی تھی۔

''نہیں یہ غلط ہے۔'' خرم اپنی جگہ حیران ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اُس کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اُسے جھٹلانا چاہتا تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔

''کیوں۔ کیا برسوں پہلے امی نے اس خوف سے گھر نہیں چھوڑا تھا اور اب دوبارہ منیب احمد کے گھر آئی بھی اسی خوف سے ہیں۔ آخر کب تک وہ انھیں بلیک میل کرتے رہیں گے اور ساتھ مجھے بھی۔ نہیں۔ نہیں کرنی مجھے شادی۔ صاف منع کر دیجیے آپ انھیں۔'' خرم قدرے سناٹے میں اُسے دیکھے جا رہا تھا، وہ خاموش ہوگئی تب بھی اسی طرح بیٹھا تھا۔ اُس کا دل ان ساری باتوں پر یقین کرنے کو آمادہ نہیں ہو رہا تھا جب کہ ذہن میں کتنی باتیں ایک ساتھ گردش کرنے لگی تھیں۔ اُسے یاد آیا جب وہ اسماء سے ملنے جا رہا تھا تو منیب احمد نے اُسے روکتے ہوئے کہا تھا کہ بس ایک دو دن کی بات ہے پھر اُس کی ممی یہیں آ جائیں گی اور پھر ممی اور عروبہ کو لے ابھی آئے تھے۔ اُس وقت اُس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ عروبہ جو اُس سے اور پاپا سے بات بھی نہیں کرتی وہ ایک دم آنے پر آمادہ کیسے ہوگئی تھی اور رات اُس نے اسماء کو لاؤنج میں کتنا پریشان دیکھا تھا۔

''وہ عروبہ کے انکار سے پریشان تھیں یا......'' اُس کے ذہن میں سوالیہ نشان بننے لگے جن کے جواب وہ اُس کے چہرے پر تلاش کر رہا تھا۔

''آپ تو ایسے حیران ہو رہے ہیں جیسے آپ کو کچھ پتا ہی نہیں۔'' وہ خرم کی غیر یقینی کیفیت سے چڑ کر بولی تھی۔

''خدا کی قسم مجھے یہ سب پتا نہیں تھا۔ گو کہ میں نے اکثر ممی کو پریشان دیکھا ہے اور ان سے پوچھا بھی لیکن وہ ہمیشہ ٹال گئیں۔ پاپا کے رویے کی بابت انھوں نے سرسری انداز میں بھی کچھ نہیں کہا البتہ تمھاری طرف سے تشویش ظاہر کرتی رہی ہیں کہ تم نے خود کو کمرے تک محدود کر لیا ہے۔ تمھاری صحت متاثر ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ رات بھی وہ تمھاری طرف سے فکر مند تھیں کہ تم شادی سے انکار کر رہی ہو۔''

''ہاں میں نے انکار کیا ہے اور ابھی بھی کر رہی ہوں لیکن اُن کی اصل پریشانی یہ نہیں ہے۔'' وہ خرم کی بے خبری پر اب کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔

''جو بھی ہو ممی کو مجھ سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔'' خرم کو حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔ ''بہر حال تم فکر مت کرو اب تمھیں کوئی مجبور نہیں کرے گا۔ تمھاری شادی وہیں ہوگی جہاں تم چاہو گی۔''

''میں چاہوں گی۔'' اُس نے سوچتے ہوئے خرم کے پیچھے دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے شجیع الحسن بیٹھے تھے اور اس پل اس پر ادراک ہوا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ لیکن اب دیر ہوگئی تھی۔

''چلیں۔'' خرم نے ویٹر کو بلا کر بل پے کرنے کے بعد اُس سے کہا۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اُس کے ساتھ باہر آتے ہی بولی۔

''بس اب گھر چلیں۔''

''اور شاپنگ......؟''

''پھر سہی۔''

''چلو میری بچت ہوگئی۔'' خرم نے اُس سے زیادہ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور اُس کے بعد بہت چاہا کہ اُس کے ساتھ یونہی ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہے لیکن کوئی موضوع ہی نہیں ملا۔ تمام راستہ خاموشی میں کٹ گیا تھا۔

''ممی، ممی'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی خرم نے اُونچی آواز میں پکارنا شروع کیا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ اسی وقت اُس کی باتوں کی تصدیق اسماء سے کرائے گا اور اُس کی بے صبری پر وہ سر جھٹکتے ہوئے اپنے کمرے میں جانے لگی تھی کہ ملازم کی بات سن کر رُک گئی۔ وہ خرم سے کہہ رہا تھا۔

''بیگم صاحب نہیں ہیں۔ صاحب کے ساتھ ہسپتال گئی ہیں۔''

''امی۔ کیا ہوا امی کو۔'' وہ تیزی سے واپس پلٹی تھی۔

''بیگم صاحبہ کو کچھ نہیں ہوا جی۔ صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ پہلے ڈاکٹر گھر آیا پھر وہی ہسپتال لے کر گیا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی ساتھ گئی ہیں۔'' ملازم نے بتایا۔ وہ خرم کو دیکھنے لگی جو پریشان ہو گیا تھا۔

"کون سے ہسپتال گئے ہیں کچھ پتا ہے......؟"

"نہیں صاب۔" ملازم نے لاعلمی ظاہر کی۔

"کیا زیادہ طبیعت خراب تھی پاپا کی۔ ممی نے جاتے ہوئے تم سے کچھ کہا تھا۔" خرم پریشانی میں ایک کے بعد ایک سوال کرنے لگا۔ "کون سا ڈاکٹر آیا تھا۔ کس نے فون کیا تھا اُسے......؟"

"آرام سے بھائی۔" اُس نے آگے آ کر خرم کا بازو تھام لیا اور صوفے پر بٹھاتے ہوئے ملازم سے بولی۔ "جاؤ پانی لے آؤ۔"

"جب ہم جا رہے تھے اُس وقت تو پاپا ٹھیک تھے۔" خرم اپنے آپ سے بولا تھا۔

"ابھی بھی ٹھیک ہوں گے آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ اپنی پریشانی چھپا کر اُسے تسلی دینے لگی۔ پھر ملازم سے گلاس لے کر اُسے تھماتے ہوئے بولی۔ "خود پر قابو پائیں۔ پھر اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کریں۔ میرا خیال ہے اُن سے معلوم ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ پاپا اُن ہی کے کلینک میں ہوں۔"

"ہاں۔" خرم گلاس رکھ کر فوراً کھڑا ہو گیا اور فون کے پاس جا کر جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"الٰہی سب ٹھیک ہو۔" وہ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے پوری توجہ سے خرم کو دیکھنے لگی تھی۔ خرم نے مختصر بات کر کے فون رکھ دیا اور بہت عجلت میں اُسے دیکھ کر بولا تھا۔

"پاپا کارڈیو میں ہیں۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔"

"میں بھی چلوں گی۔" وہ اُس کے پیچھے بھاگی تھی۔

تمام رات اسماء جاء نماز پر بیٹھی رہی تھی۔

خرم راہ داری میں ٹہلتا اور کبھی ڈاکٹروں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اور وہ آئی سی یو کے سامنے کھڑی ایک ٹک بند دروازے کو دیکھتی رہی تھی۔ جس کے اُس طرف منیب احمد جانے کس حال میں تھے۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ نہ یہ خرم سے پوچھنے کی ہمت ہو رہی تھی کیوں کہ جب وہ

خرم کے ساتھ یہاں آئی تھی تو اسماء کو روتے دیکھ کر ہی اُس کا دل سہم گیا تھا اور وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔ حالانکہ وہ اتنی کمزور کبھی نہیں تھی۔ کڑے حالات میں اسماء کی بیماری کو اُس نے تنہا فیس کیا تھا تب بھی اُس کی یہ حالت نہیں ہوتی تھی۔ اب تو جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔

خرم کتنی بار اُس کے پاس آ کر اُسے تسلی دے چکا تھا۔ اور بہت چاہا کہ وہ کہیں بیٹھ جائے لیکن ٹانگیں شل ہونے کے باوجود وہ کھڑی تھی یہاں تک کہ صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔

اسماء نماز سے فارغ ہو کر اُس کے پاس آئی تب اُس نے کسی معمول کی طرح بڑھ کر اُسے تھام لیا اور بنچ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔

"آپ تھک گئی ہوں گی امی۔ خرم بھائی کے ساتھ گھر چلی جائیں۔" اسماء نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اپنے آپ میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

اب کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ میں نے خود سنا تھا ڈاکٹر خرم بھائی سے کہہ رہے تھے کہ پاپا خطرے سے باہر ہیں۔ دیکھئے خرم بھائی آ رہے ہیں آپ خود پوچھ لیجیے اُن سے۔"

"چلیں آپ دونوں کو گھر چھوڑ آؤں۔" خرم نے قریب آتے ہی کہا۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ امی کو لے جائیں۔" وہ فوراً بولی تھی۔

"یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ شام سے پہلے پاپا سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اور ایسی حالت میں تو اُن کے سامنے جانا بھی نہیں چاہیے۔ چلیں ممی گھر چل کر آرام کریں پھر شام میں فریش ہو کر آیئے گا۔" خرم خود تھکا ہوا تھا جبھی اُس کی بات پر قدرے جھنجھلا کر بولا اور اسماء کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھا دیا۔

"کیوں نہیں دیکھنے دے رہے ڈاکٹر ہمیں۔" اُس کے ضدی لہجے پر خرم گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ چلو......" اُس نے ایک نظر آئی سی یو کے بند دروازے کو دیکھا پھر سست روی سے خرم کے پیچھے چل پڑی۔

گھر آتے ہی خرم نے ملازم کو ناشتا بنانے کا کہا اور خود شاور لینے چلا گیا۔ وہ اسماء کے

ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی اور بمشکل خود کو کوئی سوال کرنے سے روک کر اُسے تسلی دینے لگی تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد ہی خرم شاور لے کر آ گیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہی اُٹھ کر کچن میں چلی گئی اور جلدی جلدی ناشتے کے لوازمات ٹرے میں رکھ کر وہیں لاؤنج میں لے آئی۔

''چلیں امی۔ ناشتا کریں اور پھر سو جائیں۔'' خرم نے اسماء کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بس بیٹا۔ مجھے ایک کپ چائے دے دو۔''

''بالکل نہیں۔ پہلے آپ یہ سلائس لیں۔'' وہ سلائس کی پلیٹ اسماء کے سامنے رکھ کر چائے بنانے لگی۔

''اب پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ممی۔ آپ آرام کریں گی تب میں شام میں آپ کو پاپا کے پاس لے جاؤں گا اور روبا تم ممی کا خیال رکھنا۔'' خرم جلدی جلدی چائے کے ساتھ سلائس حلق سے اُتارتے ہوئے بولا۔ پھر اُسی عجلت میں اُٹھ کھڑا ہوا تو وہ ناشتا چھوڑ کر اُس کے پیچھے باہر تک آ گئی۔

''بھائی شام میں جلدی آئیے گا۔''

''ہاں۔ تم جاؤ ممی کے پاس۔ انھیں اکیلا مت چھوڑو۔ اور اُن کے ساتھ خود بھی آرام کرنا۔'' خرم تاکید کرتے ہوئے گاڑی بھگائے گیا۔

وہ گیٹ بند کر کے اندر آئی تو اچانک تھکن کا احساس عود کر آیا تھا۔ دل چاہا لمبی تان کر سو جائے لیکن ایک تو اسماء کا خیال دوسرے وہ اُس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور پھر اُس کے سونے کے بعد ہی وہ سو سکتی تھی۔ جب ہی ناشتے کے برتن کچن میں رکھ کر وہ اسماء کے ساتھ ہی اُس کے کمرے میں آ گئی اور اُسے زبردستی لٹا کر اُس کے سرہانے بیٹھی اور آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کیا ہوا تھا پاپا کو۔ کل شام میں جب میں خرم بھائی کے ساتھ جا رہی تھی اُس وقت تو ٹھیک تھے۔''

''ہاں۔ بس اچانک سینے میں درد اُٹھا تھا۔ مجھ سے ڈاکٹر کو فون کرنے کو کہا پھر ڈاکٹر آ گیا اور

اُس کے چیک کرنے کے دوران ہی انھیں اٹیک ہوا تھا۔ پھر اللہ کا شکر ہے کہ فوراً ہسپتال پہنچ گئے۔''

''ہاں اور یہ بھی شکر ہے کہ ڈاکٹر ساتھ تھے۔'' اُس نے کہا۔ پھر قدرے رُک کر پوچھنے لگی۔ ''کیا باتیں کر رہے تھے اس وقت پاپا آپ کے ساتھ؟''

''تمھاری شادی کی بات کر رہے تھے۔'' اسماء نے پہلے بے دھیانی میں جواب دیا۔ پھر ایک دم چونک کر اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو......؟''

''آپ نے انھیں بتایا تھا کہ میں شادی سے منع کر رہی ہوں۔'' اُس نے اسماء کی بات یکسر اَن سنی کر کے پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے تمھارے انکار کا نہیں بتایا تھا۔ تم غلط سوچ رہی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جس سے انھیں شاک لگتا۔'' اسماء اُس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ ''تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو بیٹا۔ تمھاری وجہ سے کچھ نہیں ہوا۔ بس جو بات ہونی ہوتی ہے اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''سچ کہہ رہی ہیں آپ......؟'' وہ غیر یقینی سی تھی۔

''میں تم سے جھوٹ کیوں کہوں گی۔ پھر بھی اگر تمھیں یقین نہیں آ رہا تو اپنے پاپا سے پوچھ لینا۔ وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھے۔'' اسماء نے بہت نرمی سے اُس کے خدشات کی نفی کی تھی۔ وہ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی پھر اُس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

''چلیں اب آپ سو جائیں۔''

''اور تم......؟''

''ہاں میں بھی سو رہی ہوں۔ وہ اُٹھ کر اسماء کے برابر آ لیٹی تو سامنے دیوار پر منیب احمد کی بڑی سی تصویر پر اُس کی نظریں جم گئیں۔ وہ دل ہی دل میں اُن کی صحت یابی اور لمبی عمر کی دعائیں مانگنے لگی تھی۔ کیوں کہ رات پہلے مقام پر ہی اُسے اس سائبان کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ گو کہ طویل عرصہ وہ اُس کے سائے سے دور رہی تھی لیکن محروم تو نہیں تھی اور محرومی کے خوف سے بھی اُس کا دل سہم کر رہ گیا تھا۔

"مس عروبہ نہیں آئیں؟" شجیع الحسن نے فائل پر سائن کرتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں اشفاق صاحب سے پوچھا تھا۔

"جی نہیں۔ ابھی تک تو نہیں آئیں۔" اشفاق صاحب نے یوں کہا جیسے ابھی بھی اُس کی آمد متوقع ہو اور وہ بھی کیوں کہ مایوس نہیں ہوئے تھے جب ہی فائل بند کر کے بولے۔

"کبھی کبھی لیٹ ہو جاتی ہیں۔"

"آج تو کچھ زیادہ لیٹ ہو گئی ہیں سر۔ بارہ بج رہے ہیں۔"

"ہوں۔" انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو اشفاق صاحت جاتے جاتے رُک کر پوچھنے لگے۔

"سر مس عروبہ نے ریزائن دے دیا ہے؟" انھوں نے اثبات میں سر ہلا کر دراز کھینچ لیا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگے۔

"اُس کا مطلب ہے اس مہینے اُن کی سیٹ خالی ہو جائے گی تو سر اس سیٹ کے لیے ایڈ....."

"مسٹر اشفاق۔" وہ آواز سے دراز بند کر کے بولے تھے۔ "مجھے جب ضرورت ہوگی تب ایڈ دینے کے لیے میں آپ ہی سے کہوں گا۔"

"لیس سر۔"

"آپ جا سکتے ہیں....." اشفاق صاحب فوراً اُن کے کمرے سے نکل گئے۔ انھوں نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالی پھر گلاس وال سے اُدھر دیکھنے لگے۔ اس چھوٹے سے کیبن نما کمرے میں وہ موجود نہیں تھی لیکن اُس کا احساس ہر شے میں جھلک رہا تھا، یا شاید انھیں محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ اُسے یہاں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ بس چند مہینے لیکن اُس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ چند مہینے ہوں، یا چند دن، زندگی کا رُخ بدلنے میں کبھی کبھی چند لمحے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اُن کے ساتھ یہی ہوا تھا اور ستم تو یہ تھا کہ اپنا سب کچھ ہار کے بھی وہ اُس کے دل کی زمین کو چھونے میں ناکام رہے تھے۔

اب تک وہ یہ سوچتے رہے تھے کہ اُس کے ساتھ کوئی مجبوری ہوگی جو وہ اُن کی محبت سے نظریں چرا رہی ہے ورنہ وہ انھیں ناپسند نہیں کرتی۔ اور اُس کی مجبوری سوچتے ہوئے انھوں نے یہ گمان بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ کل ریسٹورنٹ میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی کتنی دیر تک انھیں یقین نہیں آیا تھا اور جب یقین آیا تو پھر وہ ایک پل وہاں نہیں ٹھہر سکے تھے کہ انسان کتنا بھی مایوس ہو ایک مبہم سی آس کی ڈور تھامے رکھتا ہے۔ اور اُن کے ہاتھ سے تو وہ ڈور بھی چھوٹ گئی تھی۔ پھر اور کون سی ڈور تھی جس کے سہارے وہ اُس کے سامنے رُکتے۔ بہت خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ اُس کے بعد دل کو سمجھانا اور بہلانا آسان نہیں تھا۔ بہت کٹھن مراحل سے گزرے تھے وہ۔ تب کہیں جا کر خود کو سمجھا پائے تھے۔ اُس کے باوجود ابھی بھی شدت سے اُس کے منتظر تھے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ وہ اُن کی نہیں ہو سکتی۔ اُس کا انتظار گو کہ انھیں خود بھی عجیب سا لگ رہا تھا لیکن وہ کیا کرتے۔ بارہ کے بعد ایک پھر دو بج گئے تب اُن کا انتظار دم توڑ گیا تو وہ اُس کے نہ آنے کا سبب سوچنے لگے اور پہلا خیال ہی آیا کہ وہ اُن کا سامنا نہیں کرنا چاہتی لیکن پھر فوراً ہی انھوں نے اس خیال کو جھٹک دیا کہ اُس نے کب اُن سے کوئی عہد و پیمان کیے تھے جنھیں توڑ کر وہ اب اُن سے کترائے گی۔ اُس نے تو پہلے مقام پر ہی انھیں صاف جواب دے دیا تھا۔

اچانک فون کی بیل نے اُن کی سوچوں کو منتشر کر دیا تھا۔

"ہیلو....." انھوں نے بڑی بے دلی سے ریسور اُٹھایا تھا۔

"کہاں غائب ہو.....؟" دوسری طرف اذعان تھا۔ "کل شام سے رات گئے تک تمھارے نمبر ڈائل کر کر کے میری اُنگلیاں درد کر گئیں۔ ڈینو بابا الگ پریشان تھے۔ کم از کم انھیں تو بتا جایا کرو، ویسے گئے کہاں تھا.....؟"

"کہیں نہیں۔ آئی مین ساحل پر نکل گیا تھا۔" انھوں نے اِسی قدر کہا تھا کہ اذعان نے شوخی سے ٹوکا۔

"اکیلے یا وہ بھی ساتھ تھی.....؟"

"وہ کون.....؟" انجان بنتے ہوئے اُن کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"وہی ابابیل سی لڑکی۔" اذعان کے لہجے میں ابھی بھی شوخی تھی۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اذعان نے پکار کر پوچھا۔

"شجیع، یار کیا مسئلہ ہے......؟"

"میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں۔ تم اپنی سناؤ جرمنی سے کب آئے کیسا رہا تمھارا ٹور؟" انھوں نے بات کا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا۔

"زبردست۔ لیکن یار ماما نے بہت ایمرجنسی میں بلالیا۔ اُس سے مجھے کچھ نقصان ہوا ہے۔"

"نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے یار۔ اُس کی پرواہ مت کرو اور جو ماما کہتی ہیں وہی کرو۔"

"وہی تو کر رہا ہوں۔" اذعان جھلایا تھا۔

"اُس کا مطلب ہے شادی طے ہوگئی تمھاری۔ مبارک ہو۔" انھوں نے خوش ہو کر مبارک باد دی۔

"نہیں یار کوئی شادی وادی طے نہیں ہوئی۔ شاید لڑکی کی والدہ کو میں پسند نہیں آیا۔" اذعان اپنی بات پر خود ہی ہنسا تھا۔

"کیا مطلب......؟" وہ سمجھے نہیں۔

"مجھے نہیں پتا۔ ماما سے پوچھ لینا، اوکے۔"

"اوکے، خدا حافظ۔" انھوں نے ریسور رکھ دیا اور پھر کتنی دیر تک وہ اذعان ہی کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ انھیں لگا اذعان نے خود ہی کوئی غلط حرکت کر کے لڑکی والوں کو انکار پر مجبور کیا ہوگا۔ جیسے وہ پہلے کرتا رہا تھا۔ اور پہلے تو وہ اُس کی ایسی حرکتوں پر محظوظ ہوتے تھے لیکن اب انھیں حقیقتاً بہت افسوس ہو رہا تھا اور ماما کے ساتھ ہمدردی محسوس کرتے ہوئے انھوں نے سوچا کہ انھیں اذعان کی ان حرکتوں کے بارے میں ماما کو بتا دینا چاہیے تا کہ آئندہ وہ اُس پر کڑی نظر رکھیں۔ ورنہ اس طرح تو وہ کبھی بھی اُس کے سر پر سہرا نہیں سجا سکیں گی جو کہ اُن

کی شدید آرزو تھی۔ اور اس سوچ کے ساتھ ہی وہ اس وقت آفس سے نکل کر ماما کی طرف چل پڑے تا کہ اذعان کے آنے سے پہلے ہی وہ انھیں اُس کے بارے میں بتا سکیں لیکن اس وقت وہ سخت مایوس ہوئے جب ماما گھر پر نہیں ملیں۔ اور اُن کی واپسی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس لیے اُن کے انتظار میں بیٹھنا فضول تھا لیکن ملازم نے زبردستی انھیں چائے کے لیے رُوک لیا تھا۔

"صاحب اگر آپ چائے پیئے بغیر چلے گئے تو بیگم صاحبہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گی۔"

کچھ دیر بعد ملازم چائے لے کر آ گیا تو انھوں نے کپ تھامنے کے ساتھ ٹیبل سے میگزین اُٹھالیا اور اُس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

"ہائیں۔ اُس وقت تو تم آفس میں تھے۔" اذعان کی آواز پر وہ پہلے چونکے پھر ٹائم دیکھتے ہوئے بولے۔

"دو گھنٹے پہلے کو تم اُس وقت کہہ رہے ہو۔"

"یعنی تم سے بات ہوئے دو گھنٹے ہوگئے۔ کمال ہے وقت یوں گزر رہا ہے جیسے......" اذعان بات اُدھوری چھوڑ کر دھم سے اُن کے برابر گر گیا جس سے تھوڑی سی چائے اُن کی پینٹ پر چھلک گئی۔

"یہ کیا حرکت ہے۔" انھوں نے کپ ہاتھ سے رکھتے ہوئے ٹوکا۔

"حرکت میں برکت ہے میرے یار۔" اذعان نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولے۔

"تم کبھی نہیں سدھرو گے۔"

"بس اب کوئی لیکچر مت دینا۔ اور یہ تم یہاں آئے کیسے۔ میرا مطلب ہے فون پر تو تم نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔"

"بس اچانک پروگرام بن گیا۔ کیوں تمھیں میرے آنے پر کوئی اعتراض ہے۔" انھوں نے مبالغے سے کام لے کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ البتہ حیران ضرور ہو رہا ہوں اور وہ بھی تمھاری آمد پر نہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ

اگلا پروگرام کیا ہے۔ کہیں چلنا ہے۔" اذعان ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں تھا۔

"ہاں چلو......" انھوں نے کہا اور فوراً کھڑے بھی ہو گئے۔ اذعان اُن کی تقلید کرتے ہوئے بولا۔

"ایک منٹ۔ ماما سے کہہ دوں۔"

"مگر ماما تو گھر پر نہیں ہیں......؟"

"او گاڈ۔ میں تو بھول ہی گیا۔" مجھے ہسپتال جانا تھا، ماما وہیں ہیں۔ اذعان پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

"ہسپتال۔ کیا ہوا ماما کو؟" وہ پریشان ہو گئے۔

"ماما کو کچھ نہیں ہوا یار۔ وہ میرے فادر ان لا ایڈمٹ ہیں۔ ماما انھیں دیکھنے گئی ہیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے انھوں نے مجھے فون کیا تھا کہ میں بھی وہیں آجاؤں۔" اذعان بڑی عجلت میں بتاتے ہوئے چل پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا کہہ رہے ہو۔ فون پر تو تم نے کچھ اور بتایا تھا کہ لڑکی کی والدہ......" وہ اُلجھ رہے تھے۔

"اُس وقت میں نے ٹھیک بتایا تھا اور اس وقت بھی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اور یہ ٹھیک کیسے ہوا مجھے نہیں پتا۔ ماما سے پوچھنا۔" اذعان لاپرواہی سے کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"ماما سے نہیں اب مجھے جو پوچھنا ہو گا تمھاری بیوی سے پوچھوں گا۔" انھوں نے چڑ کر کہا۔

"ہونے والی بیوی۔" اذعان نے ہنستے ہوئے تصحیح کی۔ انھوں نے ہونٹ بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا اور تمام راستہ خاموش رہے تھے۔

"تم چلو گے یا......" ہسپتال کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے اذعان نے اُن سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں یہیں رکوں گا۔ زیادہ دیر تو نہیں ہو گی تمھیں۔" انھوں نے سہولت سے منع

کر کے پوچھا۔

"نہیں۔ میں بس خیریت معلوم کر کے آجاؤں گا۔ او کے۔" اذعان اُتر کر تیز قدموں سے ہسپتال کے گیٹ سے اندر آیا تو پہلے انکوائری سے منیب احمد کا معلوم کیا پھر لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر آیا تو لابی کے اختتام پر دائیں ہاتھ مڑتے ہی اُسے ماما نظر آگئیں۔ اُن کے ساتھ اسماء بھی تھی۔"

"السلام علیکم۔" اذعان نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اسماء نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور ماما نے زبان سے تو نہیں البتہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جیسے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے انکل کی۔" اذعان خود نہیں سمجھ سکا کہ اُس نے یہ سوال کس سے کیا تھا کیوں کہ اُس کی نظریں بیک وقت دونوں پر تھیں۔

"اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہیں تم مل لو اُن سے۔" ماما نے کہا ساتھ ہی سامنے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو اس بار وہ بہت احتیاط سے پلٹ کر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

منیب احمد کے پاس ڈاکٹر موجود تھا جو اُن کے چیک اپ کے ساتھ سسٹر کو ہدایات بھی جاری کرتا جا رہا تھا۔ اذعان اس ساری کارروائی کے دوران خاموش کھڑا رہا۔ جب ڈاکٹر اپنا کام مکمل کر چکا تب اُس نے بیڈ کے قریب آکر منیب احمد کو سلام کیا اور بے اختیار اُن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کیسے ہیں آپ......؟" منیب احمد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"مجھے ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ آپ......" اذعان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کرے۔

"یہاں کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔ آئی مین ٹریٹ منٹ......"

"نو بیٹا۔ سب ٹھیک ہے تھینک یو۔" منیب احمد نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبایا۔

"او کے۔ میں پھر آؤں گا۔"

"تمھاری ماما چلی گئیں......؟"

"نہیں۔ وہ باہر آنٹی کے ساتھ ہیں۔" اُس نے بتایا اور منیب احمد کے خاموش رہنے پر انھیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

"جا رہے ہو بیٹا۔" ماما نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔

"جی ماما، آپ چلیں گی۔"

"نہیں بیٹا۔ تمھاری آنٹی ابھی اکیلی ہیں۔ خرم آجائے پھر میں جاؤں گی۔ میرے ساتھ ڈرائیور ہے تم فکر مت کرو۔" ماما نے اُسے اپنی طرف سے اطمینان دلایا۔

"اوکے پھر میں چلتا ہوں۔" خدا حافظ آنٹی۔" اُس نے قدم بڑھانے سے پہلے اسماء کو خدا حافظ کہا پھر لابی سے مڑتے ہی قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ کیوں کہ شجیع الحسن کا خیال آ گیا تھا۔ آگے لفٹ مصروف تھی اُس نے انتظار نہیں کیا اور اسی تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر فرسٹ فور پر آیا کہ سامنے سے آتی عروبہ کو پہلے اُس نے بے دھیانی میں دیکھا پھر ایک دم سے پہچان کر اُس کا راستہ روک کر بولا۔

"ایکسکیوز می مس۔ آپ غالباً شجیع الحسن کے آفس میں ہوتی ہیں۔"

"ہوتی تھی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"کیا مطلب......؟"

"میں وہ جاب چھوڑ چکی ہوں۔" وہ عجلت میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی کہ اُس نے پھر راستہ روک لیا۔

"کیوں......؟"

"میری مرضی" وہ تنگ کر بولی۔

"بے شک آپ کی مرضی۔ لیکن......"

"پلیز۔" عروبہ نے پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈال کر اُسے سامنے سے ہٹنے کا اشارا کیا تو وہ ذرا سے کندھے اُچکا کر پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ آیا تھا۔

"کیسے ہیں تمھارے فادر اِن لا؟" اُس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی شجیع الحسن نے پوچھا۔

"بہت ہینڈسم......" وہ شریر تھا۔

"اور اُن کی بیٹی۔" شجیع الحسن بھی چھیڑنے سے باز نہیں رہ سکے۔

"اُن ہی جیسی ہوگی یا اپنی ماں پر گئی ہوگی۔" وہ یک دم بے نیاز بن گیا۔

"کیا مطلب، تم نے دیکھا نہیں اُسے۔" شجیع الحسن حیران ہوئے۔

"کیا کروں گا دیکھ کر۔ لڑکیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو ایک لڑکی اور ایک اس طرف۔ کیا فرق ہے دونوں میں۔"

"تم انتہائی فضول انسان ہو۔ میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔" شجیع الحسن اُس کی عجیب منطق پر چڑ کر بولے۔

"مت کرو۔ اور ہاں ابھی تمھاری وہ ملی تھی۔ ایک تو مجھے اُس کا نام نہیں معلوم۔ وہی ابابیل۔" اُس نے اچانک یاد آنے پر بتایا۔ شجیع الحسن بے اختیار اُس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"کہاں؟ ہسپتال میں۔"

"ہاں۔ کیا اُس نے جاب چھوڑ دی۔" وہ اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں۔" شجیع الحسن نے مبہم سا جواب دیا تھا۔

"صرف جاب چھوڑی ہے، یا تمھیں بھی......؟"

"اذعان۔" انھوں نے بہت سختی سے ٹوکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گیا لیکن پھر کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو یار۔ میں نے تو سیدھی سی بات پوچھی تھی۔ اور تم جواب نہ دو تب بھی میں جان گیا ہوں۔"

"کیا جان گئے ہو......؟" شجیع الحسن نے ناراضی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ وہ تمھارے ساتھ بے وفائی کر گئی ہے۔ جیسے اور ساری لڑکیاں کرتی ہیں۔ ہونیہہ۔" اذعان نے تاسف کا اظہار کیا۔ وہ کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے پھر بمشکل خود پر قابو پا کر

کہنے لگے۔

"بے وفائی تو جب ہوتی جب اُس نے مجھ سے محبت کی ہوتی۔ ایسا کوئی وعدہ اُس نے نہیں کیا تھا۔ اذعان اور نہ ہی میرے جذبوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ بہت خاموشی سے آئی اور اُسی خاموشی سے چلی بھی گئی۔ میرے پاس کوئی حق تھا نہ اختیار جو اُسے روک سکتا۔"

"کوشش بھی نہیں کی......؟"

"کیوں کرتا کوشش جب اُس کے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ تھا ہی نہیں۔" وہ آزردگی میں گھر گئے تھے۔

"اپنے جذبوں پر بھی بھروسا نہیں تھا......؟"

"تھا اور ہے۔ لیکن میں اُس کے دل کی دنیا کیوں اجاڑوں۔ وہ جسے پسند کرتی ہے اُس کے ساتھ خوش رہے۔" انھوں نے اُس شام کا تصور کر کے کہا جب انھوں نے عروبہ کو خرم کے ساتھ دیکھا تھا۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ تھی جو اُس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"چلو وہ تو خوش رہے گی تمھاری دعا سے اور تم کیا کرو گے۔" اذعان نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں بھی خوش رہوں گا، تمھاری دعا سے۔ وہ برجستہ بولے تھے۔

"ہاہاہا......" اذعان کا بے ساختہ قہقہہ فضا میں بکھر گیا تھا۔

"چلیں ممی۔ روبا چلو تمھیں گھر چھوڑ آؤں۔" خرم نے ٹائم دیکھ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

عروبہ بجائے اُٹھنے کے مزید ٹانگیں اُوپر سمیت کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

جی نہیں آج میں یہیں رہوں گی۔ آپ جائیں امی کو لے کر اور واپس آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"فضول منہ مت کرو۔ چلو اُٹھو......" اذعان نے اُس کا ہاتھ کھینچ کر اُٹھانا چاہا۔

"آپ کچھ بھی کہیں میں نہیں جاؤں گی۔" اُس نے کہتے ہوئے اسماء کو دیکھا تو وہ اُس کی طرف داری کرتے ہوئے خرم سے بولی۔

"چلو بیٹا، آج رہنے دو اُسے۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں ممی۔ اگر پاپا کے لیے باہر سے کوئی چیز لانی پڑی تو یہ کیا کرے گی۔" خرم نے جتنا جھنجھلا کر کہا وہ اُسی قدر اطمینان سے بولی تھی۔

"لے آؤں گی۔"

"اتنی رات میں......؟"

"ہاں اتنی رات میں۔ مجھے پتا ہے نیچے کینٹین بھی ہے اور میڈیکل اسٹور بھی۔ باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ بس جائیں امی کو لے کر۔" وہ حتمی انداز میں کہہ کر یوں بن گئی جیسے اب مزید کچھ نہیں سنے گی۔ خرم زچ سا ہو کر اسماء کو دیکھنے لگا، لیکن اس بار کچھ نہیں بولی تب ہار مان کر وہ اُس سے مخاطب ہوا۔

"سنو! صرف آج۔"

"کل انشااللہ پاپا گھر ہوں گے۔ وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور انھیں لفٹ تک چھوڑ کر واپس کمرے میں آئی تو پہلے منیب احمد کے قریب رُک کر بہت احتیاط سے اُن کا کمبل ٹھیک کیا پھر تھرماس سے کپ میں چائے نکال کر کھڑکی کے قریب چیئر پر آ بیٹھی۔ اس وقت تک وہ بالکل خالی الذہن تھی۔ لیکن جب ہر سو خاموشی پھیلی ہو اور تنہائی بھی ہو تو ایسے میں انسان اکثر ماضی ہی کی طرف سفر کرتا ہے۔ اُس کے خالی ذہن میں بھی دھیرے دھیرے گئے دنوں کے حالات و واقعات گردش کرنے لگے تھے۔ بچپن سے اب تک جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا اور وہ اتنی محو تھی کہ منیب احمد کی آواز سنائی ہی نہیں دی۔ دوسری اور پھر تیسری بار انھوں نے جانے کیسے پکارا تھا۔ وہ نہ صرف چونکی بلکہ فوراً اُٹھ کر اُن کے قریب آ گئی۔"

"جی پاپا......" منیب احمد نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور اُسے اپنے اُوپر جھکے دیکھ کر بے اختیار انھوں نے اپنے ہاتھ سے اُس کا گال چھوا جیسے یقین کر رہے ہوں۔ پھر پوچھنے لگے۔"

''خرم کہاں ہے......؟''

''بھائی امی کو لے کر گھر گئے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کیا چاہیے آپ کو۔'' اُس نے آہستہ سے اُن کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔

''آپ میرے پاس ہو بیٹا اور کیا چاہیے۔'' منیب احمد نے اُسے پاس بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے بیٹھتے ہوئے اُن کا ہاتھ ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا پھر پوچھنے لگی۔

''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں پاپا۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا۔''

''نہیں نہیں بیٹا۔ آپ نے تنگ نہیں کیا۔ گناہ گار تو میں ہوں آپ کا آپ کی امی کا۔ آپ مجھے معاف کر دو۔''

''نہیں پاپا......'' وہ تڑپ کر بولی۔ ایسا نہ کہیں۔ آپ کو پتا ہے میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔ بیٹیاں کتنی محبت کرنے والی ہوتی ہیں اور میری بدقسمتی کہ میں اس محبت سے دور رہا۔'' منیب احمد کی آواز بھرا رہی تھی۔

چھوڑیں پاپا۔ اب تو میں آپ کے پاس ہوں اور بس آپ جلدی سے اچھے ہو کر گھر چلیں۔''

''ہاں۔ اب تو میں بھی گھر جانا چاہتا ہوں۔ منیب احمد آنکھیں بند کرتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولے تھے۔ وہ کچھ دیر انھیں دیکھتی رہی اُن کے چہرے پر وہی اطمینان اور سکون اُتر رہا تھا جو وہ انھیں دینا چاہتی تھی۔ اُس کے بعد وہ خود بھی مطمئن ہو کر وہاں سے اُٹھی تھی اور بس تھوڑی دیر ہوئی پھر کبھی کمرے میں اور کبھی لابی میں نکل کر ٹہلتی رہی تھی یہاں تک کہ فجر کی اذان ہونے لگی۔ اُس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اُجالا پھیلنے تک جاء نماز پر ہی بیٹھی رہی۔ جب ڈاکٹر منیب احمد کو چیک کرنے آیا تب جیسے اُسے بھی ہوش آیا تھا۔ جاء نماز لپیٹ کر ایک طرف رکھی اور منیب احمد کے پیروں کے پاس کھڑے ہو کر بہت خاموشی سے ڈاکٹر کو چیک کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ پھر ڈاکٹر کے پیچھے ہی باہر نکلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب پاپا کب تک یہاں رہیں گے؟''

''آپ اگر ابھی لے جانا چاہتی ہیں تو میں منع نہیں کروں گا کیوں کہ اب ٹریٹ منٹ سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ نہ صرف غذا میں بلکہ دوسرے کام کاج میں بھی کوئی ٹنشن نہیں ہونی چاہیے۔ او کے......'' ڈاکٹر نے دوسرے روم میں داخل ہونے سے پہلے رُک کر اُسے دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر آگے نکل آئی۔ خرم کو ناشتا لے کر آنا تھا اور اُسے دیکھنے کے لیے ہی وہ ریلنگ کے پاس رُکی تھی کہ مانوس آواز پر اُس کا دل بڑی زور سے دھڑکا اور وہ بے اختیار آواز کی سمت پلٹی تھی۔

''السلام علیکم......'' شجیع الحسن بس ایک قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اُس کے پلٹنے پر دوبارہ سلام کیا تو وہ بمشکل سر ہلا سکی۔

''کیسی ہیں آپ......'' انھوں نے پوچھا۔ اس بار بھی اُس نے ذرا سا سر ہلایا تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ وہ یہاں کس کے ساتھ ہے۔ اور وہ سمجھ کر بھی خاموش رہی۔ تب انھوں نے براہِ راست پوچھا۔

''خیریت، یہاں کون ہے......؟''

''میرے فادر......'' اُس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''کیا ہوا ہے انھیں......؟''

''انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ اب اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہیں۔ آپ کیسے آئے؟'' اُس نے بتا کر پوچھا۔ شجیع الحسن انجان سے بن گئے۔ اب اُسے کیا بتاتے کہ وہ اُسے ہی دیکھنے آئے ہیں۔ کل جب سے اذعان نے بتایا تھا کہ وہ یہاں ملی تھی اس وقت سے وہ بے چین تھے اور رات کتنی دیر تک سوچتے رہے تھے کہ وہ ہسپتال میں کیوں ہے۔ اور اب وہ کسی طرح بھی خود کو اُس کے پاس آنے سے روک نہیں سکے تھے۔

''سر! آپ کا کوئی عزیز۔'' س نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بہت عزیز۔'' وہ بے اختیار بولے۔ پھر پوچھنے لگے۔

"کیا میں آپ کے فادر سے مل سکتا ہوں؟" وہ سوچ میں پڑ گئی کہ انھیں پاپا کے پاس لے جائے، یا نہیں۔

"چلیں پھر سہی۔" انھوں نے اُسے شش و پنج میں دیکھ کر خود ہی آئندہ پر ٹال دیا۔ اُس نے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو جیسے آپ کی مرضی۔

"او کے۔ سی یو۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ اس کی نذر کر کے واپس پلٹ گئے تو اُن کے پیچھے دیکھتے ہوئے اُس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

منیب احمد گھر آ گئے تھے۔ عروبہ خود اُن کے لیے پرہیزی کھانا تیار کرتی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق صبح شام انھیں لان کے دو چکر لگواتی اور اس دوران اُن کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتی۔ اسماء کو اُس نے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ کوئی بھی مسئلہ منیب احمد کے سامنے بیان نہ کرے۔ آفس سے آنے والے فون بھی وہ خود اٹینڈ کرتی تھی۔ اُس کے بعد بہت سرسری انداز میں منیب احمد کو بتاتی۔ اُس کی اتنی احتیاطوں کا بڑا اچھا نتیجہ نکلا تھا کہ چند دنوں میں ہی منیب احمد کو ڈاکٹر نے مکمل فٹ قرار دے کر آفس جانے کی اجازت بھی دے دی۔ یوں پھر زندگی کی پہلے والی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ البتہ وہ اب بالکل گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن پہلے کی طرح اپنے کمرے میں بند نہیں رہتی تھی۔ سارا دن کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ پھر بھی بہت جلدی بور ہو گئی کیوں کہ وہ کبھی اس طرح گھر تک محدود نہیں رہی تھی۔ پہلے اسکول پھر کالج اُس کے بعد جاب۔ اتنی مصروف زندگی کے بعد اب اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ بالکل بے کار ہو کر رہ گئی ہے۔ گو کہ اس پر کوئی پابندی، یا روک ٹوک نہیں تھی لیکن وہ کہاں جاتی، کوئی ایسی دوست بھی نہیں تھی۔ سارا دن اِدھر سے اُدھر چکراتی رہتی، یا پھر کبھی اسماء اور کبھی اپنے مٹھو کے ساتھ تھوڑی باتیں کر لیتی۔ خصوصاً دل کی باتیں وہ مٹھو کے ساتھ ہی کرتی تھی۔ جیسے اس وقت کہہ رہی تھی۔

"میں بہت بور ہو گئی ہوں یار۔ بتاؤ کیا کروں۔ جاب نہیں کر سکتی۔ پاپا کو پسند نہیں ہے نا۔ اور اب میں پاپا کو کبھی ناراض نہیں کروں گی۔"

"روبا، روبا۔" طوطے نے چلانا شروع کر دیا۔

"مجھے پتا ہے تم کیا جاننا چاہتے ہو۔" وہ پنجرے پر ہاتھ مار کر طوطے کو خاموش کراتے ہوئے کہنے لگی۔ "وہ کہانی ختم ہو گئی۔ وہی شجیع الحسن والی۔ اُسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ویسے نقصان بھی کوئی نہیں ہے۔ خیر چھوڑو۔"

"روبا۔" اسماء نے پکارنے کے ساتھ اُس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اُس نے جلدی سے پنجرے کی طرف پشت کر لی۔

"کیا کر رہی ہو بیٹا؟" اسماء نے اندر آتے ہوئے یونہی پوچھ لیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے......؟"

"نہیں۔ ہاں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ آؤ یہاں آ کے بیٹھو۔" اسماء نے اُس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اُسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی۔" وہ بیٹھ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو اسماء بغیر کسی تمہید کے بولی تھی۔

"بیٹا! بیگم شیرازی کتنی بار آ چکی ہیں۔ اور اب تو اصرار کر رہی ہیں کہ ہم شادی نہیں تو منگنی ہی کر دیں۔"

"پھر۔ میرا مطلب ہے آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔" اُس نے اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا تم ہامی بھرو تو میں انھیں کوئی جواب دوں۔" اسماء نے کہا، وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگی۔

"پاپا کیا کہتے ہیں......؟"

"انھیں یہ رشتہ پسند ہے۔ لیکن وہ فوراً شادی کے حق میں نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے فی الحال منگنی کر دیتے ہیں اور اُس کے لیے انھوں نے کہا ہے کہ میں تم سے پوچھ لوں۔"

"میں کیا بتاؤں۔ بس جیسے آپ اور پاپا چاہیں۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔" وہ جانے کس احساس میں گھر کر بول رہی تھی۔ شاید شکست خوردگی کا احساس تھا جو اسماء کو محسوس ہی

نہیں ہوا، جب ہی خوش ہو کر بولی تھی۔

''خوش رہو۔ اب بیگم شیرازی آئیں گی تو میں اُن سے کہہ دوں گی کہ وہ منگنی کی تاریخ طے کرلیں۔ بہت خوش ہوں گی وہ۔ اسماء اسی طرح خوشی کا اظہار کرتی اُٹھ کر چلی گئی۔ اور اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی زندگی میں آنے والے اس موڑ کا استقبال کس طرح کرے کہ اُس کے اندر کوئی اُمنگ تھی نہ آرزو۔ گہرا سناٹا تھا جس میں کسی وقت کچھ ٹوٹنے کی آواز ارتعاش پیدا کردیتی تھی۔

''ٹھیک تو ہے میں منع کروں بھی تو کس کے لیے۔'' اُس نے دُکھ سے سوچا۔ اُس شخص کو تو میں نے پہلے ہی مایوس کردیا جس نے پوری ایمان داری سے مجھے پرپوز کیا تھا۔ اُس کے بعد کوئی بھی ہو۔ امی اور پاپا کی خوشی کے لیے اب مجھے خاموش ہی رہنا ہے۔''

شجیع الحسن جب تک بہنوں کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہوئے تھے تب تک اُن کے سامنے زندگی کا ایک مقصد موجود تھا۔ اور انھوں نے اپنی ذات کی نفی کرکے بہنوں کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھائیں تھیں۔ اُس کے بعد اچانک ہی اُن کی زندگی میں خوب صورت موڑ آیا تھا۔ عروبہ کی صورت۔ جیسے حقیقتاً انھوں نے خدا کی طرف سے انعام سمجھا تھا۔ اور سوچا تھا کہ انھیں زیادہ عرصہ اکیلے نہیں رہنا پڑے گا۔ بہت جلد عروبہ اُن کی تنہائیاں سمیٹنے آجائے گی۔ لیکن وہ لڑکی اُن سے دامن بچا گئی تھی۔ گویا زندگی میں بہار آتے آتے رہ گئی تھی۔ اور اب تو وہ بھی سوچتے تھے کہ کاش وہ اُن کی زندگی میں آئی ہی نہ ہوتی تو اُن کی بہنیں جہاں کہتیں وہ شادی کرلیتے اور اپنی زندگی گزاتے لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔ اُس سے ہٹ کر وہ سوچ بھی نہیں پا رہے تھے۔ جہاں اپنا خیال آتا وہاں وہ موجود ہوتی۔ عجیب سی بے کلی تھی۔ کسی بات کسی کام میں دل لگتا تھا نہ بہلتا تھا۔ اُس وقت وہ آفس سے جلدی اُٹھ آئے تھے۔ کتنی دیر سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑاتے رہے پھر اس خیال سے کہ اذعان کی اوٹ پٹانگ باتوں اور حرکتوں سے کچھ اُن کا دھیان بٹ جائے گا وہ اذعان کے گھر آئے تو آگے وہ اور ماما کہیں

جانے کو تیار کھڑے تھے۔

''شجیع آ گیا ماما۔ اب ایسا کریں اپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔ میں شجیع کو کمپنی دوں گا۔'' اذعان نے اُن کی آمد پر خوش ہو کر کہا۔ غالباً وہ ماما کے ساتھ جانا نہیں چاہ رہا تھا۔

''نہیں۔ شجیع تمھیں کمپنی دے گا۔ چلو شجیع تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔'' ماما نے اذعان کو گھور کر کہا۔ وہ پوچھنے لگے۔

''کہاں ماما......؟''

''اذعان کے سسرال۔'' ماما نے اسی قدر کہہ کر دونوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''آپ جائیں ماما۔ میں پھر آجاؤں گا۔'' انھوں نے دامن بچانا چاہا۔

''کیوں تمھیں وہاں جانے پر کوئی اعتراض ہے۔ تم اذعان کے بھائی نہیں ہو کیا۔ اُس کی شادی کے سارے انتظام تم ہی کو کرنے ہیں۔'' ماما باقاعدہ کلاس لینے کھڑی ہو گئیں۔

''جی ماما سب میں ہی کروں گا۔ ابھی آپ کس سلسلے میں جا رہی ہیں؟'' وہ بوکھلا گئے تھے۔

''جاؤں گی تو سلسلہ آگے بڑھے گا۔ تم دونوں چل رہے کہ نہیں......؟'' ماما نے کچھ ناراضی سے دونوں کو دیکھا۔

''جی ماما بالکل چل رہے ہیں۔ چلو۔'' انھوں نے فوراً اذعان کو آگے دھکیلا پھر اُس کے پیچھے ماما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چل پڑے۔ اور تمام راستہ وہ ماما کو خوش کرنے کی خاطر اذعان کی شادی کی باتیں کرتے رہے تھے۔ جب کہ اذعان مسلسل ویو مرز میں انھیں گھورتا رہا تھا۔

''اب تمھارے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔'' انھوں نے گاڑی سے اُترتے ہوئے مسکرا کر اذعان سے کہا تھا۔ پھر ماما کی تقلید کرتے ہوئے دونوں اندر آئے تو پہلے مرحلے پر ہی شجیع الحسن ٹھٹھک کر رُک گئے تھے کیوں کہ سامنے اسماء کے ساتھ منیب احمد کھڑے تھے۔ جنھیں وہ پہلی نظر میں ہی پہچان گئے تھے۔ اُس کے بعد اُن کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا کریں۔

"شجیع آؤ بیٹا۔" ماما نے اسماء سے ملنے کے بعد اُن کی طرف دیکھا۔ وہ خاصے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ماما کے پکارنے پر کسی معمول کی طرح قدم بڑھا کر آگے آ گئے اور بمشکل سلام کر سکے۔

"یہ شجیع ہے اور یہ صرف اذعان کا دوست ہی نہیں بھائی بھی ہے۔ میرے لیے بالکل اذعان کی طرح۔" ماما نے اُن کے تعارف میں کہا، تو منیب احمد نے انھیں بھی گلے لگایا۔ غالباً وہ بالکل نہیں پہچانے تھے۔ جس پر انھیں کوئی تعجب نہیں ہوا لیکن وہ اطمینان سے بھی نہیں ہو سکتے تھے، کہ وہ جو دامن بچا گئی تھی وہ تو انھیں پہچانتی تھی اور اُس سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اذعان بھی اُسے پہچانتا تھا۔

"اذعان میں چلوں۔" جب ماما بیٹھ گئیں تو انھوں نے اذعان کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

"شٹ اپ۔" اذعان نے اُن کا ہاتھ کھینچ کر بیٹھتے ہوئے انھیں بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"یا اللہ! یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔" انھوں نے خود کو بے انتہا بے بس محسوس کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔ ماما اسماء اور منیب احمد کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں اور اذعان جیب سے موبائل نکال کر اُس کے بٹنوں سے کھیلنے لگا۔ انھیں اذعان کی یہ حرکت غیر اخلاقی لگ رہی تھی کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ضرور ٹوکتے ابھی تو اپنی حالت غیر تھی۔ کچھ دیر بعد اذعان نے انھیں کہنی مار کر اپنے موبائل کی طرف متوجہ کیا تو اُن کی نظریں اسکرین پر جا ٹھہریں۔

"یار تم تو یوں سر جھکائے بیٹھے ہو جیسے تم بر دکھاوے کے لیے آئے ہوں۔" انھوں نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اذعان کو دیکھا۔ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ وہ بُری طرح سلگ گئے اور دانت پیس کر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ عروبہ آ گئی، غالباً انجانے میں آئی تھی کچھ کہتی ہوئی کہ پھر ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔"

انھوں نے اُس کی طرف نہیں دیکھا لیکن اُس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو پہلے مرحلے پر ہی سب کچھ جان گئے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ لیکن انھیں یہ اُمید نہیں تھی کہ اذعان اس طرح کرے گا۔ وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ماما پلیز۔ گھر چلیں۔"

"کیا بات ہے بیٹا۔" ماما نے بہت ضبط کا مظاہرہ کیا تھا، اور یہ غنیمت تھا کہ اذعان مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا تب وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ اور بہت سنبھل کر پہلے منیب احمد سے مخاطب ہوئے۔

"سوری سر، اصل میں اُس کی طبیعت......"

"ہاں میں محسوس کر رہا تھا۔ کیا ہوا ہے؟" منیب احمد نے جیسے اُن کی بات رکھ لی تھی۔

"وہ۔ میں دیکھتا ہوں۔" انھیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اذعان کو دیکھنے کے بہانے اُس کے پیچھے نکل آئے۔ یہ صورت حال اُن کے لیے تکلیف دہ کے ساتھ مضحکہ خیز بھی تھی کیوں کہ وہ کوئی نوعمر لڑکے نہیں تھے۔ بہر حال اذعان پر غصہ آنے کے باوجود انھوں نے فوراً اُس سے کچھ نہیں کہا کیوں کہ وہ بہت جارحانہ انداز میں اسٹرینگ سنبھالے بیٹھا تھا۔ جب ماما آئیں تو انھوں نے جلدی سے اُن کے لیے اگلا دروازہ کھول دیا اور خود پیچھے بیٹھ گئے۔ اُن کا خیال تھا گاڑی اسٹارٹ ہونے کے ساتھ ہی ماما کے سوال بھی شروع ہو جائیں گے لیکن وہ بالکل خاموش تھیں۔ اذعان کی رف ڈرائیونگ پر بھی نہیں ٹوکا اور جب اُس نے اپنے بنگلے پر گاڑی روکی تب شاید ماما سمجھ گئی تھیں کہ اُن کے اُترتے ہی وہ گاڑی بھگائے جائے گا جب سپاٹ اور سخت لہجے میں بولی تھیں۔

"تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔" اُس کے ساتھ ہی اُتر کر اندر چلی گئیں۔ اذعان نے گاڑی بند کر دی اور اُن کی طرف دیکھے بغیر بولا تھا۔

"میں ماما کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔"

"اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" وہ بھی اُسی کے انداز میں بولے۔ پھر اُس کے ساتھ اندر آئے تو ماما مکمل سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ اور وہ جو کہہ رہا تھا کہ میں ماما کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا، وہ اپنے آپ بول پڑا۔

"ماما آپ نے میرے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے وہ مجھے نہیں شجیع کو پسند کرتی ہے۔"

پھر آپ بتائیں میں کیسے اُس سے شادی کر سکتا ہوں۔ نو، نیور۔ میں شادی سے منع نہیں کر رہا لیکن یہاں نہیں، آئی مین عروبہ کے ساتھ نہیں۔ وہ اور شجیع ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ پوچھ لیں شجیع سے۔'' ماما کے غصے کی جگہ حیرت نے لے لی۔ اور وہ اُسی حیرت سے شجیع الحسن کو دیکھنے لگیں۔ اُن کا دل چاہا اذعان کو جھٹلا دیں لیکن اُس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی قیمت پر بھی عروبہ سے شادی پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ماما کے دیکھنے پر انھوں نے سر جھکا لیا تھا۔

''اُف! یہ سب تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' ماما اپنے پیچھے صوفہ دیکھ کر اُسی پر ڈھے گئیں۔

''پہلے میں نے لڑکی دیکھی کب تھی۔ اور یہ تو اچھا ہوا ابھی دیکھ لی ورنہ اگر شادی کے بعد دیکھتا تو......'' اذعان نے قصداً بات اُدھوری چھوڑ دی۔ پھر اُن سے کہنے لگا۔ ''تم کیوں سر جھکائے کھڑے ہو۔ کوئی جرم کیا ہے کیا......؟''

''شٹ اپ......؟'' انھوں نے آواز دبا کر ٹوکا۔

''کوئی شٹ اپ وٹ اپ نہیں۔ اب تو میرے بولنے کا وقت آیا ہے۔ ہاں تو مما پھر کب چل رہیں ہیں شجیع کا پرپوزل لے کر۔ بس اب آپ پہلے اُس کی شادی کریں پھر میں بھی کر لوں گا۔''

''ٹھیک۔'' اذعان ماما کے پیروں کے پاس باقاعدہ اُلٹی پالتی مار کر بیٹھ گیا جیسے ابھی اُن کی شادی کا سارا پروگرام طے کر کے اُٹھے گا۔

''تم دونوں نے تو مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے......'' ماما بُری طرح اُلجھ گئیں۔ پھر سوچتے ہوئے بولیں۔ ''اسی لیے بیگم منیب ہامی نہیں بھر رہی تھیں۔ وہ بیٹی کی پسند جانتی ہوں گی۔''

''بالکل جانتی ہوں گی۔'' اذعان فوراً بولا تھا۔ پھر انھیں دیکھ کر مسکرایا تو اب وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ ماما کے قریب آ کر کہنے لگے۔

''ماما! آپ اُس کی باتوں میں مت آئیے۔ یہ سچ ہے کہ میں عروبہ کو پسند کرتا ہوں لیکن

اُس کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''نہیں ہوئی تو اب ہو جائے گی۔'' اذعان پھر بول پڑا۔

''تم چپ رہو۔'' ماما نے اذعان کو ڈانٹ دیا پھر اُن سے کہنے لگیں۔ ''بیٹا میرے لیے تم اور اذعان ایک جیسے ہو۔ مجھے اگر پہلے معلوم ہوتا تو میں اذعان کی بجائے تمھارا ہی پرپوزل لے کر جاتی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ مجھے بس اتنا یقین دلا دو کہ تم اُس لڑکی کے لیے واقعی سنجیدہ ہو۔''

''میں میں یقین دلاتا ہوں۔'' اذعان کے لیے چپ رہنا بہت مشکل تھا۔ پھر اب تو اُسے ایک موقع ہاتھ آیا تھا۔

''اذعان......'' ماما کے تنبیہی لہجے کا اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

''قسم سے ماما میں سب جانتا ہوں۔ شجیع اُس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اس نے قسم بھی کھائی ہے کہ اگر اُسے عروبہ نہ ملی تو یہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔'' وہ ایک سانس سے بولے چلا جا رہا تھا۔ ماما کبھی اُسے دیکھتیں کبھی شجیع الحسن کو جن کی مسکراہٹ اُس کی تصدیق کر رہی تھی۔

''وہ شجیع الحسن اور اذعان کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن پھر وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اذعان اُٹھ کر چلا کیوں گیا تھا۔ جب کہ اسماء اور منیب احمد کتنی دیر تک اِسی بات میں اُلجھتے رہے تھے۔ اور اپنے طور پر جانے کیا کچھ قیاس بھی کرتے رہے تھے۔ اُس نے وہاں سے آتے جاتے اُن کی باتیں سنی تھیں۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ البتہ اطمینان سے صرور ہو گئی تھی کہ خطرہ ٹل گیا۔ اور اس وقت اذعان کی طرح وہ بھی شکر کر رہی تھی کہ یہ معاملہ اِسی وقت سامنے آ گیا شادی کے بعد تو پتا نہیں کیا ہوتا۔ بہر حال اب اُسے انتظار تھا کہ اسماء اُس سے اس سلسلے میں کب بات کرتی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ اسماء صرف اتنا کہے گی کہ وہ رشتہ ختم ہو گیا۔ اور ایسا ہی ہوا، لیکن اُس کے ساتھ ہی اسماء نے شجیع الحسن کا نام بھی لے دیا۔

''شجیع الحسن۔'' دھڑکنوں کے شور میں اُسے اپنی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

"ہاں بیٹا۔ مجھے بیگم شیرازی نے سب بتا دیا ہے۔ تمھیں بھی نہیں چھپانا چاہیے تھا۔ شجیع اچھا لڑکا ہے۔ تمھارے پاپا کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔" اسماء نے پیار سے اُس کی ٹھوڑی چھو کر کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔ وہ واقعی اُلجھ رہی تھی۔"

"کیا نہیں سمجھ رہیں۔ اچھا ہاں میں نے ہی پوری بات نہیں بتائی۔ بیگم شیرازی نے اذعان کی طرف سے معذرت کر کے شجیع الحسن کا پرپوزل دیا ہے۔ تمھیں اس پر اعتراض تو نہیں ہے۔" اسماء کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اُس نے ٹپٹا کر نظریں چرالیں۔

"بتاؤ بیٹا۔" بیگم شیرازی انتظار میں بیٹھی ہیں۔ کہہ رہی ہیں منہ میٹھا کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔" اسماء نے اُس کا ہاتھ ہلایا۔

"میں کیا کہوں امی۔ جیسا آپ اور پاپا چاہیں۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔

"ہم دونوں کو تو کوئی اعتراض نہیں۔" اسماء نے فوراً کہا اور اُس کے مسکرا کر سر ہلانے پر اُس کی پیشانی چوم کر چلی گئی تو وہ بھاگ کر پنجرے کے پاس آگئی۔

"مٹھو! یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ کیا تقدیر یوں بھی مہربان ہوتی ہے۔ مجھ پر ہو گئی ہے۔ پوچھو گے نہیں کیسے...... پوچھونا......" اُس نے پنجرے پر ہاتھ مارا۔ طوطا چلانے لگا۔

"روبا۔ روبا۔"

"بہت آسان ہے نا روبا کہنا۔ شجیع کہو تب مانوں گی۔" وہ اٹھلائی۔ کھلکھلائی پھر ایک دم پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ کیوں کہ اب اُسے دل کی باتیں کہنی ہی نہیں سننی بھی تھیں۔

نگہت عبداللہ ہمارے ملک کی نامور اور اعلیٰ پائے کی لکھاری ہیں۔ کتب بینی کا شوق رکھنے والوں کے لیے ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی ذات بے شمار خصائص اور خوبیوں کی حامل ہے۔

انسان کی فطرت اور نفسیات کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا جائے تو اس بات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ خوشی میں انسان مطمئن اور شاد نظر آتا ہے لیکن جب کوئی مصیبت یا پریشانی آئے تو چیدہ چیدہ لوگ ہی اس صورت حال کا خوش دلی، ہمت اور زندہ دلی سے سامنا کرتے ہیں نگہت میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے یوں لطف اندوز ہوتی ہیں کہ انسان بے اختیار رشک کرنے لگتا ہے۔

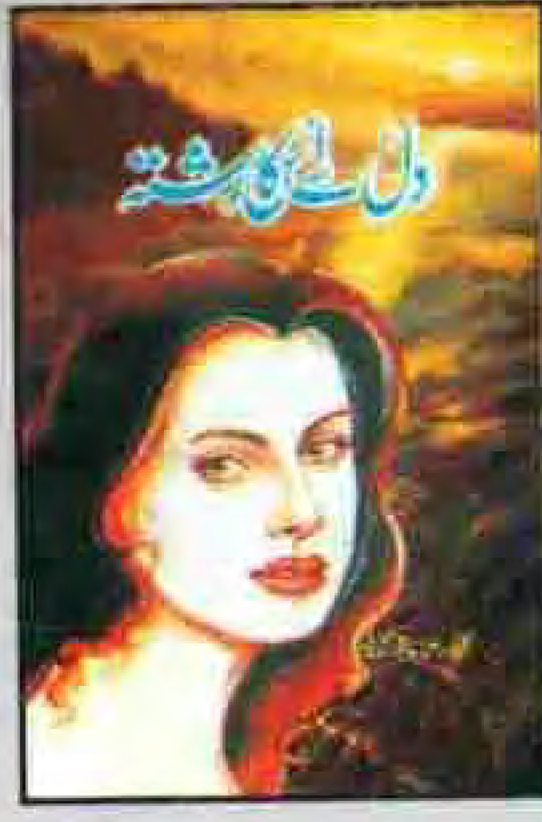
ہنستے ہوئے نگہت کی آنکھوں میں اشکوں کے موتی تیرنے لگتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر اس طرح کے لوگ مخلص اور بحرانی صورت حال پر قابو پانے والے ہوتے ہیں۔ نگہت اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنے کے ذوق کی تسکین کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتی ہیں بظاہر ہنستی مسکراتی نگہت اندر سے انتہائی حساس دل کی مالک ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مجھ میں بعض ایسی خصوصیات ہیں جو میرے لیے اندرونی راحت اور تسکین کا باعث ہیں۔

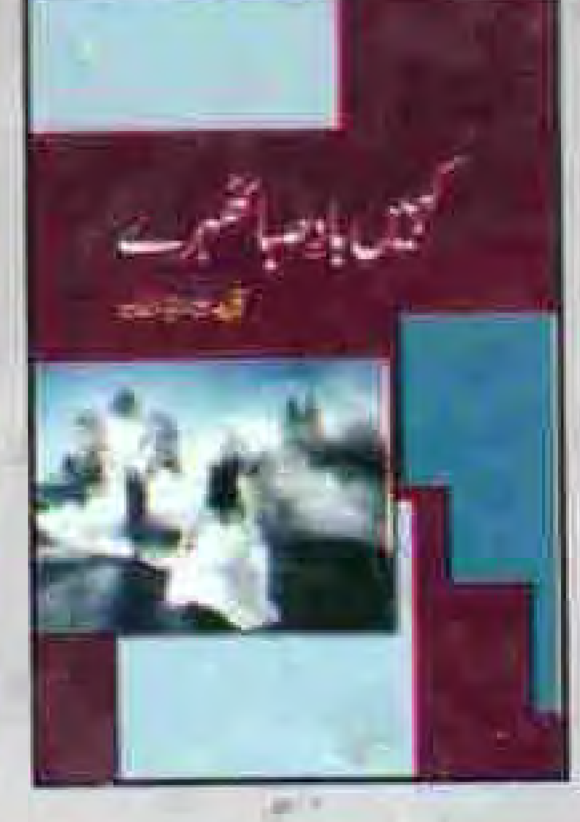
ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ نگہت عبداللہ تصنع، بناوٹ اور دکھاوے سے کوسوں دور ہیں اور یہی بات کسی اچھے لکھاری کی پہچان ہوتی ہے۔

نگہت عبداللہ کے دیگر طبع شدہ ناول

دل پھولوں کی بستی

کہاں رُکے ہیں محبت کے قافلے

















خزینۂ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
فون: 37211468-37314169